کلیات کمار پاشی

(جلد دوم)

مرتب

چندر بھان خیال

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

کلیات کمار پاشی

(جلد دوم)

مرتب

چندر بھان خیال

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون ایف سی، 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	2014
تعداد	:	550
قیمت	:	-/157روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	1183

Kulliyat-e- Kumar Pashi Vol.II

By: Chander Bhan Khayal

ISBN :978-93-5160-032-9

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی110025، فون نمبر:49539000، فیکس:49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر:26109746
فیکس:26108159 ای۔میل:ncpulsaleunit@gmail.com
ای۔میل:urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ:www.urducouncil.nic.in
طابع: ہائی ٹیک گرافکس، ڈی8/2، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز II، نئی دہلی۔110020
اس کتاب کی چھپائی میں70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

شنکر دت کمار پاشی (93-1992) اردو کے جدید شعرا میں ایک نمایاں نام ہے۔ تقسیم ہند کے سبب وہ بغداد الجدید (پاکستان) سے ہجرت کر کے اہل خاندان کے ساتھ دلّی آئے اور تمام عمر دلّی شہران کا میدان عمل رہا۔ ترقی پسندوں کے یہاں انسانی معاشرے کو اولیت حاصل ہے تو جدت پسندوں نے معاشرے کے مقابلے فرد کو اہمیت دی۔ کمار پاشی جدید ہوتے ہوئے بھی مغرب کی اندھی نقل کی بجائے ہندوستان کی قدیم تہذیب سے رابطہ قائم کرتے ہیں اور پرانے موسموں کی آواز کو جدید رنگ و آہنگ کے ساتھ اس حسن و خوبی اور کمال فن سے پیش کرتے ہیں کہ ایک نئی آواز بن جاتی ہے۔ یہی نئی آواز ان کی منفرد شناخت ہے۔

کمار پاشی نے اپنے ملک کی گمشدہ آبادیوں میں بیٹھ کر عصر حاضر کے انسانی مسائل کو جاننے سمجھنے اور انہیں شعری پیکر میں ڈھالنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ وہ انسان کی وسیع تر داخلی دنیا کو جلتے سلگتے اندھیروں سے باہر نکال کر ان کے اجالے میں اسی ہنرمندی سے اجاگر کرتے ہیں کہ حیرت اور سراسیمگی سے پُر ایک نئی دنیا نظر آنے لگتی ہے۔ یہ دنیا شاعر کی خلق کی ہوئی اپنی دنیا ہوتی ہے۔ اسی کا نام تخلیق ہے۔ تخلیق وہ ہے جس کا پہلے سے کوئی وجود نہ ہو۔ لیکن اس جہان میں کچھ بھی تو ایسا نہیں جن کا پہلے سے وجود نہ ہو، پھر تخلیق کیا ہے۔ دراصل فنکار کی ہنرمندی

کا نام ہی تخلیق ہے۔ ہم اپنے گھر کی دیوار پر چھپکلی کو دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ لیکن جب فنکار اپنی ہنرمندی سے ایک کاغذ پر اس کی خوبصورت پینٹنگ بناتا ہے تو ہم بخوشی اپنے گھر کی دیوار پر سجا لیتے ہیں، یہی تخلیق ہے۔ اسی ہنرمندی سے کمار پاشی نے شعری دنیا کو تخلیق کیا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں ملک کے دیگر اشاعتی اداروں پر جو اولیت حاصل کی ہے، اس کا ذکر کرنا خودستائی ہوگی۔ میں صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ نئے نئے موضوعات پر مبنی کتابوں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے اہم ترین ادبا اور شعرا کے نام کو منظر عام پر لانا بھی کونسل کے ایجنڈے میں شامل ہے۔ کلیات کمار پاشی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
ڈائرکٹر

فہرست

حصہ شاعری

1	اک موسم مرے دل کے اندر (1979)	478
2	اردھانگنی کے نام (1987)	589
3	چاند چراغ (1994)	672

حصہ نثر

4	پہلے آسمان کا زوال (کہانیاں) (1972)	794
5	جملوں کی بنیاد (یک بابی ڈرامے) (1974)	865

اک موسم مرے دل کے اندر
اک موسم مرے باہر

ترتیب

		صفحہ
1	غزل	484
2	سیلف پورٹریٹ	485
3	غزل	487
4	دعا دیتے چلو	488
5	خبروں سے پرے	490
6	سوگندھی	491
7	دسمبر جا	494
8	آنگن آنگن	496
9	غزل	497
10	چاسالہ	496
11	دتی:25/جون75	502
12	نیند آنے پر	504
13	ماں کی چوکھٹ پر	505
14	غزل	506

15	میرا دکھ پہچانو	507
16	تیری مخلوق تجھ سے مخاطب ہے	508
17	خالی	511
18	دُور کا منظر	512
19	قریب کا منظر	513
20	غزل	514
21	تن آسانی	515
22	گواہی کون دے گا	516
23	آزاد شہری: ایک تعارف	518
24	آنے والے مجھ جیسے	520
25	ری جک ٹڈ	521
26	ایک شخص	522
27	ایک اور شخص	523
28	دو یا پتی کے رنگ میں	525
29	سچ کی تلاش	526
30	جوڑ رتے ہیں	527
31	غزل	528
32	اسے زندہ نہیں دیکھا	529
33	ایک ڈائن کے قید خانے میں	531
34	ایودھیا! میں آ رہا ہوں	533
35	ننھی منی خواہش	537
36	مفرور	538
37	دُور اس جزیرے سے	539

38	رات آنے پر	541
39	منٹو	542
40	جو لوگ لوٹیں گے	544
41	نوحہ	545
42	یاد کی لو	547
43	میرا سین کے لیے	548
44	رات	552
45	غزل	554
46	وہ کا تعارف	555
47	تو سنو.........	557
48	گمشدہ لفظ	559
49	او عبدالماجد ہو تھرے	561
50	مرے آگے، مرے پیچھے	562
51	نکھری ستھری شاموں میں	564
52	جو بچھڑ گیا	566
53	اُداسی کا دوسرا نام	568
54	غزل	577
55	کرشن	578
56	ایک نظم تمھارے لیے	581
57	دور، میرے اندر	583
58	غزل	585
59	تمھارے نام لکھتا ہوں	586
60	جب دھوپ کھلے گی	588

پپی، ششی، منجو، انجو، اور شوانی

کے لیے

تمھارے نام لکھتا ہوں ستارے، تتلیاں، جگنو

مناجات

ہے اندھیرا بہت اُجالا دے
راہ بھولا ہوں مجھ کو رستا دے
دھوپ میں گھر گیا ہوں سایہ کر
میری بنجر زمیں کو سبزا دے
چار دن اور مجھ کو زندہ رکھ
خشک ٹہنی کو سبز پتا دے
بخش دے اب گناہ گاروں کو
بستیاں جل رہی ہیں برکھا دے
اپنی پہچان کھوچکا ہوں میں
میری بے چہرگی کو چہرا دے
میری رسوائیوں پہ پردا رکھ
میری عریانیوں کو کپڑا دے
مجھ کو میرے لیے فراہم کر
اپنے ہونے کا مجھ کو مژدا دے
وہ زباں دے جو ہو پسند تجھے
جولبھائے تجھے وہ لہجہ دے

غزل

وہ حکمِ زباں بندی لگانے بھی نہ دے گا
پر دل کی کوئی بات سنانے بھی نہ دے گا
اعلان بھی کردے گا کہ روشن کرو رستے
ظلمت میں چراغوں کو جلانے بھی نہ دے گا
بخشے گا مجھے فرضِ مسیحائی بھی لیکن
مرتے ہوئے لوگوں کو بچانے بھی نہ دے گا
آزاد بھی کردے گا مجھے مرگ و فنا سے
جینے کے لیے مجھ کو بہانے بھی نہ دے گا
دے گا وہ دعائیں بھی کہ سایہ رہے مجھ پر
راہوں میں مگر پیڑ اُگانے بھی نہ دے گا
خوابِ درو دیوار بھی دکھلائے گا لیکن
اُجڑے ہوئے لوگوں کو ٹھکانے بھی نہ دے گا
کہہ دے گا نہ اب یاد کروں میں اُسے پاشی
جب بھولنا چاہوں تو بھلانے بھی نہ دے گا

سیلف پوٹریٹ

یہ طے ہے تم اگر اُس شہر کی تصویر دیکھو گے تو ہرگز خوش نہیں ہو گے
میں جب یہ بات کہتا ہوں تو لفظوں سے پرے جو منظرِ موہوم ہے
وہ جاگ اُٹھتا ہے
دھوئیں اور گرد میں ڈوبی ہوئی تصویر میری
مجھ سے صدیوں دُور سے آواز دیتی ہے

میں اپنی سیکڑوں راتوں کے ملبے کے تلے
اک شہر کو چلتے ہوئے محسوس کرتا ہوں
کوئی کہتا ہے:
دیکھو کس قدر بد بخت ہے یہ شخص
جو اپنی حدوں کو توڑ کر گہرے دھندلکوں میں رواں ہے ایک مدت سے
جسے ہنسا نہیں آتا

میں ڈر جاتا ہوں، خود سے پوچھتا ہوں :

اپنے بچوں کو خوشی کا ایک بھی لمحہ نہیں دو گے؟
مگر اُس وقت لفظوں سے پرے جو منظرِ موہوم ہے
وہ سرسراتا ہے

مری تصویر جو شاید پرانی سی پرانی ہے
مرے شانوں پہ سر رکھ کر سسکتی ہے
مری ننھی سی بچی مجھ سے کہتی ہے :
مرے اچھے سے پاپا!
کیا تمھیں ہنسنا نہیں آتا؟

میں اپنے ہاتھ پھیلاتا ہوں، دل ہی دل میں کہتا ہوں :
خدا ــــــ میرے خدا
مجھ کو بھی تو اپنے خزانے سے
مری بچی کی خاطر ہی سہی، تھوڑی خوشی دے دے
خوشی کا ایک لمحہ
صرف اک لمحہ خوشی دے دے

غزل

تو اپنے چاروں طرف موت کا اندھیرا لکھ
پر اُس کے گرد شگوفے کھلا اُجالا لکھ

دِکھا اُبھرتی ہوئی نو بہ نو زمینوں کو
اور اپنے آپ کو اک ڈوبتا جزیرا لکھ

نکل پڑے ہیں گھروں سے ڈرے ڈرے سایے
سفر سیاہ ہے ان کا کہیں سویرا لکھ

بلا کی پیاس ہے دم توڑتے ہیں بے بس لوگ
جو ہو سکے تو مقدر میں اِن کے دریا لکھ

جلا دے آج تو اک اک کا زرق برق لباس
اور اپنے شہر کے ہر آدمی کو ننگا لکھ

کیوں اپنی ذات کے جنگل میں کھو گیا پاشی
کبھی تو خود سے نکل دوسروں کا قصا لکھ

دعا دیتے چلو

دعا دیتے چلو ان کو
جنھیں جینا نہیں آتا
جو شب بھر شہر کی سڑکوں پہ
آدم خور گھوڑوں کی طرح سے ہنہناتے ہیں

دعا دیتے چلو ان کو
ہمارے شہر میں چرچے ہیں جن کی بے لباسی کے
جو اپنے آپ سے مل کر بھی شاید خوش نہیں ہوتے
وہ جن کے قد بہت چھوٹے نظر آتے ہیں دنیا کو
جو اپنے پیٹ کے بل رینگ کر چلنے میں شاید عافیت اپنی سمجھتے ہیں۔
دعا دیتے چلو ان کو
کہ جن کے غم بڑے خوشیاں ہیں چھوٹی سی
کہ جو بکھرے ہوئے ہیں اپنے افسانوں کی صورت
جسم کی سنسان بستی میں

دعا دیتے چلو
ایسا بھی دن آئے
ازل سے منتشر بد بخت روحوں کو
کوئی آکر سمیٹے
اور ان کو شکل دے کوئی
تو شاید آئینہ ہم کو ہمارا گمشدہ چہرہ بھی لوٹا دے
دعا دیتے چلیں ـــــ آؤ!

خبروں سے پرے

کل سے اک اک شخص سکھی ہے
اپنے شہر کے اک اک شخص کے
چہرے پر بھرپور خوشی ہے
کل سے یعنی نہیں سنی ہے
کسی کی ہا ہا کار کسی نے
پڑھا نہیں اخبار کسی نے

سوگندھی

اک موسم مرے دل کے اندر
اک موسم مرے باہر
اک رستہ مرے پیچھے بھاگے
اک رستہ مرے آگے
بیچ میں چپ چپ کھڑی ہوں جیسے
بوجھی ہوئی بجھارت
کس کو دوش دوں، جانے مجھ کو
کس نے کیا اکارت

آئینہ دیکھوں، بال سنواروں
لب پہ ہنسی سجاؤں
گلا سڑا وہی گوشت کہ جس پر
جیتی رنگ چڑھاؤں

جانے کتنی برف پگھل گئی
بہہ گیا کتنا پانی
کس ندیا میں ڈھونڈوں بچپن
کس دریا میں جوانی

رات آئے مری ہڈیاں جاگیں
دن جاگے میں سوؤں
اپنے اُجاڑ بدن سے لگ کر
کبھی ہنسوں، کبھی روؤں
ایک بھیانک سپنا: آگ میں لپٹی جلتی جاؤں
چولی میں اُڑسے سکوں کے سنگ پگھلتی جاؤں

اک موسم مرے دل کے اندر
اک موسم مرے باہر
اک رستہ مرے پیچھے بھاگے
اک رستہ مرے آگے
رستے بیچ میں کھڑی اکیلی
کب سے تجھے بلاؤں
اس لمبی تاریک سڑک پر کب تک چلتی جاؤں
کیوں نہیں ذہن کی دیواروں سے
ٹکراؤں، مر جاؤں

شمع سر یکھی پگھل رہی ہوں

اوجھل کبھی اجاگر
اک موسم مرے دل کے اندر
اک موسم مرے باہر

مجھ سے ملنے کون آئے اب ان تنہا راہوں پر
بوٹی بوٹی بٹ گئی میری روشن چوراہوں پر
اس گہرے سناٹے میں کس کو آواز لگاؤں
کون آئے گا مدد کو میری
کیا چیخوں، چلاؤں
اپنے مردہ گوشت کی چادر
اوڑھ کے چپ سو جاؤں
اور اچانک نیندوں کی دلدل میں گم ہو جاؤں
کسی کے ہاتھ نہ آؤں
خود کو میں خود ڈھونڈنے نکلوں
لیکن کہیں نہ پاؤں

دسمبر جا

دسمبر جا
اکیلا چھوڑ دے مجھ کو

نہ صبحیں دھوپ والی دے نہ شامیں رنگ والی دے
مرے شہرِ خموشاں کو فقط راتیں تو کالی دے
تو اپنے ساتھ یہ نیندوں بھری ٹھنڈی ہوا لے جا
یہ موسم، یہ مناظر اور یہ پُر افسوں فضا لے جا
دسمبر جا

نہ رونے کی اجازت ہے
نہ ہنسنے کی تمنا ہے
مرے اندر، مرے باہر
یہ کیسا سخت پہرا ہے
مرے نزدیک یہ بڑھتا اندھیرا کتنا گہرا ہے

دسمبر آ
مقدّس آسمانوں سے اُترتی سانولی سی شام، یہ جام و سبو لے جا
مری نس نس میں ہولے سے جواب بھی سرسراتا ہے لہو لے جا
دسمبر آ
دسمبر جا———

آنگن آنگن

میرے آنگن کی کیاری میں
ابھی ابھی
اک پھول کھلے گا
جس میں سے
سورج نکلے گا
لیکن تب تک
ہم دونوں ہی
اپنا اپنا گوشت اوڑھ کر
سو جائیں گے

غزل

جگنو کوئی ظلمت کو مٹانے کے لیے دے
اک خواب تو آنکھوں میں سجانے کے لیے دے
لے چاک کیے لیتا ہوں میں اپنا گریباں
اب دشت مجھے خاک اُڑانے کے لیے دے
ہر پیڑ کو شاخیں کبھی سر سبز عطا کر
ہر شاخ کو کچھ پھول سجانے کے لیے دے
اک نور فضا میں ہے تو اک رنگ ہوا میں
منظر یہ مجھے سب کو دکھانے کے لیے دے
خوشیاں دے کہ میں بانٹ سکوں اہلِ زمیں کو
اور درد مجھے دل میں چھپانے کے لیے دے
سیراب کرے دشت کو جو اپنے لہو سے
ایسا کوئی کردار نبھانے کے لیے دے

چاسنالہ ____ 1

تم نہتے تھے
مجبور تھے
اور میری دعا کے اثر سے بہت دور تھے

میں یہاں
تم سے صدیوں پرے سے
تمھاری المناک چیخوں کو سنتا رہا
تا حدِ فکر پھیلی ہوئی
ڈھیریوں سے یونہی
بے اثر لفظ چنتا رہا
اپنے چاروں طرف
اک خریدے ہوئے کرب کا
جال بنتا رہا
اے مرے دل!

کسی خوف سے سہمے سہمے مرے دل، بتا :
تجھ پہ لازم ہے کیا؟
جبر کی گہری دلدل میں ڈوبا رہے
چپ رہے

میری کمزور آواز سے دُور
صدیوں پرے
کوئلے کی مہیب اور مردار کانوں میں سڑتی ہوئی
بکھری لاشو اُٹھو
اور بتاؤ :
میں اب کس لیے چپ رہوں
کیا حراست میں ہوں؟

چاسنالہ ____ 2

روشنی بھی نہیں ہے
ہوا بھی نہیں
کیا کسی نے، کسی سے کہا
یہ کسی نے، سنا بھی نہیں
کیا گزرتی ہے اک دوسرے پر
کوئی جانتا بھی نہیں
وہ جو اک بار تھک کر گرا
وہ اُٹھا بھی نہیں
وہ جو گر کر اُٹھا
دو قدم وہ چلا بھی نہیں

ایک دوجے سے ہم
ٹوٹ بھی اب چکے ہیں
جدا بھی نہیں

اپنی بے نور آنکھوں میں
خوابوں کا اندوختہ بھی نہیں
وہ جو اپنے سروں پر
تھا اک ضوفگن
وہ خدا بھی نہیں

جس قدر، پاس ہیں
اُس قدر دور ہیں
کتنے مجبور ہیں

ایسا لگتا ہے ہم
چاسالہ کی کانوں میں محصور، ـــــــ بد بخت
مزدور ہیں

دلی: 25 / جون 75

پل ہی پل میں یہ سارا تماشا ہوا
شہر کے پاؤں میں سنسناتی ہوئی
ایک گولی لگی
اور وہ چکرا کے
دھرتی پہ اوندھا گرا
دیکھتے دیکھتے اس کے چاروں طرف
خون کا ایک تالاب سا بن گیا

جھاڑیوں سے ڈری سہمی چڑیاں اُڑیں
اونچے اونچے درختوں کے
گنجان پتوں میں دُبکے ہوئے
سب پرندے اُڑے
چیختے چیختے ——
اور دہشت زدہ آسمانوں

کے صحراؤں میں کھو گئے

خون کا ایک چھوٹا سا تالاب ہے
اُس میں چپ چاپ اوندھا پڑا شہر ہے
کاش دے کر ذرا سا سہارا اُسے
اب اٹھا لے کوئی
اس کی ایڑی کی ہڈی میں اٹکی ہوئی
گرم زہریلی گولی نکالے کوئی
شہر زندہ ہے اب تک
بچا لے کوئی

نیند آنے پر

میں جب سو جاؤں گا، تو رات
ناخن گاڑ دے گی
میرے سینے میں

میں روؤں گا
بہت چلاؤں گا، لیکن
مری آواز، میرے گھر کی دیواریں نہ ہرگز توڑ پائے گی
یونہی تا دیر
گہری ظلمتوں میں چھٹ پٹائے گی

مگر جب صبح
سورج کی حسیں کرنیں
جگانے مجھ کو آئیں گی
مرے بستر پہ وہ مجھ کو نہ پائیں گی
نہ جانے کھوج میں میری
وہ تب کس اور جائیں گی

ماں کی چوکھٹ پر

جو بھی کچھ اچھا تھا مجھ میں
میرے دل میں
کھو چکا ہوں
نامرادی کا سفر طے کرتے کرتے
آج پھر اک بار ——
ماں!
در تک ترے میں آ گیا ہوں
دیکھ کتنا ڈھیٹ ہوں
میں جانتا ہوں
اب بھی دامن کو مرے بھر دے گی تو اچھائیوں سے
اور اب بھی میں
گنوا دوں گا انھیں
گھر لوٹنے تک
اپنے اندر کی گھنی پرچھائیوں میں

نیند آنے پر

میں جب سو جاؤں گا، تو رات
ناخن گاڑ دے گی
میرے سینے میں

میں رووں گا
بہت چلاؤں گا، لیکن
مری آواز، میرے گھر کی دیواریں نہ ہرگز توڑ پائے گی
یونہی تا دیر
گہری ظلمتوں میں چھٹ پٹائے گی

مگر جب صبح
سورج کی حسیں کرنیں
جگانے مجھ کو آئیں گی
مرے بستر پہ وہ مجھ کو نہ پائیں گی
نہ جانے کھوج میں میری
وہ تب کس اور جائیں گی

ماں کی چوکھٹ پر

جو بھی کچھ اچھا تھا مجھ میں
میرے دل میں
کھو چکا ہوں
نامرادی کا سفر طے کرتے کرتے
آج پھر اک بار ———
ماں!
در تک ترے میں آ گیا ہوں
دیکھ کتنا ڈھیٹ ہوں
میں جانتا ہوں
اب بھی دامن کو مرے بھر دے گی تو اچھائیوں سے
اور اب بھی میں
گنوا دوں گا انھیں
گھر لوٹنے تک
اپنے اندر کی گھنی پرچھائیوں میں

غزل

اپنی تو تقدیر میں شب بھر خاک اُڑانا ہوگا ہی
یار تو سارے بچھڑ چلے ہیں اُن کا ٹھکانا ہوگا ہی
دن چڑھ آیا کیوں نہیں آئے جائیں ان سے پوچھ آئیں
لیکن اُن کے پاس تو اے دل کوئی بہانا ہوگا ہی
آؤ چلیں ان کی محفل میں اور اپنی سدھ بدھ کھودیں
آج بھی یارو اُن آنکھوں میں کوئی فسانہ ہوگا ہی
صبح کو شب کہہ دیتے ہیں ہم سچ کو جھوٹ بتاتے ہیں
ہم جیسے سر پھروں سے تو ناراض زمانا ہوگا ہی
اے رنگوں میں چلتی ہوا، میرا سندیسہ لیتی جا!
تیرا تو ان کی گلیوں میں آنا جانا ہوگا ہی
آج ملا تھا پاشی سے میں وہ بھی ہے شاداب بہت
مری طرح اس کے دل میں بھی غم کا خزانا ہوگا ہی

میرا دکھ پہچانو

جانے آنے والی گھڑیاں
مرے لیے کیا لائیں
کوّے آج فجر سے کرتے
چھت پر کائیں کائیں
جن سے بچھڑے عمر گزر گئی
ان کی یاد دلائیں
اُڑ جائیں کہو- دُور دیس میں
کوئی سندیسہ لائیں
مجھ سے لوگ بھرے گھر میں بھی
خود کو اکیلا پائیں
درد میں ڈوبے گھائل من بھی
کیا کہہ کر سمجھائیں
میرا دکھ تو وہ جانیں گے
دُور ہیں جن کی مائیں

تیری مخلوق تجھ سے مخاطب ہے

میرے اندر نفاست نہیں
گرد ہی گرد ہے

تم کبھی میری کھڑکی سے جھانکو
تو دیکھو مجھے
میں نہیں یہ
کوئی دوسرا ہے
مرا بھوت ہے
میرے اندر ——— یہاں سے وہاں
دندناتا ہوا
اپنے سوکھے، سڑے گوشت کے
چیتھڑوں کو اُڑاتا ہوا

پہلے وہ کتنا نزدیک تھی

ہاتھ اپنا بڑھاؤں تو چھولوں ـــــ مگر
آج کتنے دھند لکے ہیں
اس کے مرے درمیاں
تا حدِ جسم و جاں

آسماں ـــــ
بول!
وہ جس کو دیکھا تھا صبحوں نے تیری کبھی
کھلکھلاتے ہوئے
وہ کہاں کھو گیا؟
آج اُس کی لکھی سب کتابوں میں بھی
اس کی تصویر ملتی نہیں
لفظ ہیں : ہڈیوں کی طرح کھوکھلے
بے صدا

اے خدا ـــــ
تیری مخلوق تجھ سے مخاطب ہے : سن!
اِن کے ہاتھوں میں
اِن کے گناہوں کی فہرست دے
اور صدیوں سے پہلے کا لکھا ہوا
فیصلہ
آج اِن کو سنا
اے خدا ـــــ

تیرے موسم بھی مجھ کو نہ بہلا سکے
میری نیندیں نہ خوابوں سے مہکا سکے
کوئی اَن دیکھا منظر نہ دکھلا سکے

کوئی ہے؟
جو اندھیروں کے انبار میں
میرے کھوئے ہوئے نقش کو
ڈھونڈ کر لا سکے؟

خالی

کچھ نہیں ہے
ایسا لگتا ہے کہ میرے پاس اب کچھ بھی نہیں ہے
جو بھی کچھ تھا کب کا ضائع کر چکا ہوں
زیست مجھ کو جانے کب کا کھا چکی ہے
رفتہ رفتہ
بزم اپنے خاتمے پر آ چکی ہے
مے کی وہ بوتل ہوں
جو پی جا چکی ہے

دور کا منظر

ایک منظر سامنے ہے، ایک منظر دُور کا
بیچ میں حائل ہے گویا ایک یگ کا فاصلہ
پڑھ رہا ہوں اک نظر کو دُور نظاروں کے بیچ
دیکھتا ہوں ایک چہرہ اجنبی شہروں کے بازاروں کے بیچ
سونگھتا ہوں اک بدن کو دل کی دیواروں کے بیچ

سات ساگر پار جا کر کھو گئی ہے جو صدا
زندگی کی شام!
اس کو ڈھونڈ لا ــــــــ

فریب کا منظر

کچھ لطف نہیں نظاروں میں
پت جھڑ نے خیمے گاڑ دیے ہیں چار طرف گلزاروں میں
سناٹا پہرہ دیتا ہے اب شور بھرے بازاروں میں
ایسی کوئی بھی خبر نہیں چھپتی ہے مگر اخباروں میں
کچھ لوگوں کا ہے شور بہت اونچی اونچی دیواروں میں
اک چمک ابھی تک باقی ہے
اِن زنگ لگی تلواروں میں

غزل

پل ہی پل میں زیست کے سارے نشاں گم ہو گئے
ہر طرف اُجڑے مکیں ہیں اور مکاں گم ہو گئے

ظلمتوں کے ہم سفر ہیں صبح کے پیغامبر
رات کے پچھلے پہر، دے کر اذاں گم ہو گئے

زیست کا لمبا سفر ہے اور تنہائی کی رات
ہم قدم تھے جو، نہ جانے وہ کہاں گم ہو گئے

بھول جا اب ان کو جو تاریک راہوں میں مرے
آ انھیں ڈھونڈیں جو زیرِ کہکشاں گم ہو گئے

دھرتیوں پر اب نہیں محفوظ سا گوشہ کوئی
سر پہ جو سایہ فگن تھے آسماں گم ہو گئے

وہ کہ آتا تھا جنھیں پاشیؔ ظفر مندی کے ساتھ
وہ جو گزرے تھے اِدھر سے کارواں گم ہو گئے

تن آسانی

رات !ـــــــ تو جانے کب آئی
کب چلی گئی
یہ سب مجھ کو معلوم نہیں ہے
میں تو
دن چڑھتے ہی
دھوپ میں جا لیٹا تھا
اُجلی اُجلی سی یادوں کی
میٹھی، نرم، و شال دھوپ میں
جو گہری نیندیں لاتی ہے
بحر و بر پر چھا جاتی ہے

گواہی کون دے گا

گذشتہ کچھ دنوں سے
ایک ڈائن نے
مرے کھیتوں پہ قبضہ کر رکھا ہے
اور مجھے معلوم ہے
جب ایک پگلی رات
اُس کے پیٹ کے اندر سمائے گی
وہ مجھ کو
پاؤں کی جانب سے کھائے گی
مری سب ہڈیوں کو
گاڑ دے گی وہ
پرانے پیڑ کے نیچے
[جسے بچپن میں خود میں نے لگایا تھا]

مجھے معلوم ہے

میں پھر کبھی پیدا نہیں ہوں گا
کوئی پیدا نہیں ہو گا
پرانا پیڑ، جس میں دفن ہونا ہے مجھے
اس بے صدا بنجر میں وہ بھی چپ کھڑا ہو گا
بتاؤ تب
مرے مسمار ہونے کی گواہی کون دے گا اس بیاباں میں؟

مجھے معلوم ہے
دراصل میں ہی وہ پرانا پیڑ ہوں، جس کو
وہ ڈائن ایک وحشی رات کی
جی دار ظلمت میں گرا دے گی
مجھے ـــــــ میری ہی مردہ ہڈیوں کی
[تنگ اور تاریک گلیوں کی]
سیاہی میں چھپا دے گی

آزاد شہری : ایک تعارف

وہ مرنے پہ راضی نہیں تھا
بڑا ڈھیٹ تھا
شاہی فرمان پر
اُس نے اپنی زباں کاٹ لی تھی

وہ آنکھوں سے اندھا تھا
کانوں سے بہرا
اُسے اپنے چاروں طرف
دیکھنے کی اجازت نہیں تھی
سماعت پہ پابندیاں تھیں
مگر شاہی دستور میں
ذکر ایسی کسی بات کا بھی نہیں تھا

وہ آزاد تھا
اپنے گھر کی حدوں تک
بدن کی تہوں تک
وہ آدھا ادھورا تھا
دل اُس کا
گہرے عذابوں سے خالی نہیں تھا
سنا ہے : وہ اس پر بھی
مرنے پہ راضی نہیں تھا

وہ خوش تھا : کہ اُس ملک کے
شاہی دستور میں
اُس کو آزاد لکھا گیا تھا

آنے والے مجھ جیسے

وہ جو کل آنے والے ہیں
ان کے دکھ بھی گہرے ہوں گے
وہ بھی خوشیوں کو ترسیں گے
ان پر بھی کچھ پہرے ہوں گے
مری طرح ان کی آنکھوں میں
لیکن خواب سنہرے ہوں گے

ری جکٹڈ

بیوی اب اس سے اکثر جھگڑا کرتی ہے
بچے بھی اب اس کا کہنا نہیں مانتے
غصہ اس کو اب بھی اکثر آجاتا ہے
لیکن اب وہ اندر ہی اندر کڑھتا ہے
اب وہ اپنے آپ کو بھی بوڑھا لگتا ہے

ایک شخص

یوں تو آدھی رات گئے وہ گھر جاتا ہے
خود کو لیکن یہیں کہیں وہ دھر جاتا ہے
بیٹھے بیٹھے کھو جاتا ہے دھند میں اپنی
جانے ایسا کون ہے جس سے ڈر جاتا ہے
ہونے کا احساس کرا دیتا ہے سب کو
محفل میں ہر شخص کو تنہا کر جاتا ہے
رنگ سہانے لے جاتا ہے ساتھ وہ اپنے
ایک کسیلا زہر ہوا میں بھر جاتا ہے

ایک اور شخص

اسے ہر شہر سے تم اجنبی بن کر گزرنے دو
نہ جانے کون سا غم ہے اُسے
کس درد کے نشے میں وہ مخمور رہتا ہے
جو سچ پوچھو:
تو وہ خود سے بھی کوسوں دُور رہتا ہے

وہ گھر میں ہے، وہ دفتر میں
وہ بازاروں میں، گلیوں میں
اسے ہر صبح دیکھو گے، اسے ہر شام دیکھو گے
بیاضِ دل پہ اُس کی کچھ مٹے سے نام دیکھو گے
وہ اک افسانۂ غم: ہر دلِ بسمل میں ملتا ہے
جدا ہر بزم سے ہے اور ہر محفل میں ملتا ہے
کبھی وہ روبرو ہوگا کبھی اوجھل میں دیکھو گے
کبھی تم اس کو جگمگ رات کے آنچل میں دیکھو گے

وہ خود میں مر چکا، اب اُس کو کچھ بھی کر گزرنے دو
اسے روکو نہ تم اب ہر بلندی سے اُترنے دو
اندھیروں میں بکھرنے دو

ودیاپتی کے رنگ میں

بھور بھئی اب اُٹھ بیٹھوں اُس کو بھی جگادوں
سیج سے اُتروں اور اُس کو شرنگار کرادوں
ہلکا ہلکا عطر لگادوں انگ انگ پر
کنگھا لے کر اُس کے بکھرے بال بنادوں
لاڈ پیار سے چولی پہنادوں سینے پر
ساڑی باندھوں، کاندھے پر پلو لہرادوں
گلے میں مالا ڈالوں اور آنکھوں میں کاجل
گورے چٹے گالوں پر سرخی پھیلادوں
ناک میں نتھ پہناؤں اور کانوں میں جھمکے
پھر اُس کے ماتھے پر اک بندی چمکادوں
آخری بار اُسے میں اپنے انگ لگا کر
کوی شیکھر 1 کی کویتا کو ساکار بنادوں

میتھلی کوی ودّیاپتی نے اپنے کچھ گیتوں میں شیکھر تخلص بھی باندھا ہے۔

سچ کی تلاش

جھوٹ: گوشت ہے بڑے جانور کا ـــــــ خستہ
نمکین اور کھٹا

جب سے میرے دانت اُگے ہیں
چبا رہا ہوں
خون کی بوسیدہ نلیوں میں
سچ کتنی مقدار میں باقی ہے
اندازہ لگا رہا ہوں
تم ہی بتاؤ :
کیا جھوٹا ہوں؟

جو ڈرتے ہیں

جو رسوائی سے ڈرتے ہیں
انھیں میری ضرورت ہے
مکمل رات ہوں میں
اور بحر و بر پہ چھایا ہوں
میں اب اک بے کراں سایے کا سایہ ہوں

میں جو کچھ ہوں : وہ ظاہر ہوں
مرا ظاہر : مرے احساس کا جلتا، سلگتا باغ ہے کوئی
مرا ظاہر : مری لاحاصلی کا داغ ہے کوئی

میں ظاہر میں وہی ہوں
جس کو گہری رات کہتے ہیں
خدا کی ذات کہتے ہیں

غزل

جھوٹ کو عادت بنالوں مصلحت اوڑھا کروں
دوست کہتے ہیں کہ پی کر بھی نہ سچ بولا کروں

زہر کتنا بھی ہو باہر کی فضاؤں میں مگر
فکر میں مصری بھروں اظہار کو میٹھا کروں

دن میں ہنس ہنس کر ملوں اپنوں سے بھی غیروں سے بھی
رات کو گھر کے در و دیوار سے جھگڑا کروں

دیکھ لے وہ بھی مرے آنگن میں پھیلی صبح کو
مر گیا ہے جو مرے اندر اُسے زندہ کروں

ساحلوں کی ریت کیا دے گی پتہ پاشی مجھے
اُتروں پانی میں تو گہرائی کا اندازہ کروں

اسے زندہ نہیں دیکھا

اسے زندہ نہیں دیکھا گیا ہے ایک مدت سے
اسے ڈھونڈو
وہ اپنے ذہن کی تاریک دلدل میں
کہیں لت پت پڑا ہوگا

مجھے معلوم ہے یہ شہر اک شہرِ خموشاں ہے
مگر زندہ ہے سایوں میں یہاں بیمار آبادی
اسی گنجان آبادی کے اک گوشے میں اُس نے بھی
کبھی پایا تھا سب سے مختلف خود کو
اسے کب موت آئی، کب جلا وہ گھر کے کونے میں
کوئی تو جانتا ہوگا
کوئی تو جانتا ہوگا کہ وہ آبادیوں کے شور سے کیوں بچ کے چلتا ہے
اُسے کس نے سلگنے کی سزا دی ہے

کہاں ہے شہر اُس کا جس نے دیکھا تھا اسے آوارگی کرتے
سرِ شب مے کشی کرتے
کہاں ہے شہر اُس کا جس نے دیکھا تھا اسے بزمِ طرب میں گفتگو کرتے
کسی کی آرزو کرتے

مجھے معلوم ہے خود کو میں جب تنہا کبھی محسوس کرتا ہوں
تو وہ ماضی کے پس منظر میں آتا ہے نظر مجھ کو
مجھے اپنا سمجھ کر پوچھتا ہے :تم نے دیکھا ہے وہ شہر گم شدہ میرا
مجھے معلوم ہے وہ شہر اس کے ذہن کی تاریک دلدل میں
کہیں لت پت پڑا ہوگا
اسے ڈھونڈو
اسے زندہ نہیں دیکھا کسی نے ایک مدت سے

ایک ڈائن کے قید خانے میں

جب درختوں کی شاخوں سے، سوکھے ہوئے زرد پتے گریں گے
بہار آئے گی
ایک مثبت رویے کے حامل یہ الفاظ
میرے نہیں
ایک ڈائن کے ہیں
جو خزاں کی علامت ہے
لیکن گزشتہ کئی سال سے
جو بہاروں کے خوش خواب دکھلا رہی ہے
[اسے میری کمزوریوں کا پتہ ہے]

میں اک گمشدہ قوم کا فرد ہوں
آج میری نسوں میں لہو سرسراتا نہیں ہے
کہ گاڑھا، کسیلا سا کیچڑ ہے
جو راہ پاتا نہیں ہے

میں اب مضمحل سا
اک ایسے گڑ کے کنارے کھڑا ہوں
جو کب سے مجھے
منہ کو پھاڑے ہوئے تک رہا ہے
مجھے لگ رہا ہے
مرے جسم میں آج بھی جی رہا ہے کوئی
کہ جو رہ رہ کے یہ پوچھتا ہے: بتا
بچ نکلنے کا بھی راستہ ہے کوئی؟

ایودھیا! میں آرہا ہوں

ایودھیا! آرہا ہوں میں
میں تیری کوکھ سے جنما
تری گودی کا پالا ہوں
تری صدیوں پرانی، سانولی مٹی میں کھیلا ہوں

مجھے معلوم ہے تو مجھ سے روٹھی ہے
مگر اب دُور تجھ سے رہ نہیں سکتا
پرائے دیس میں گزری ہے جو مجھ پر
وہ خود سے بھی کبھی میں کہہ نہیں سکتا
ذرا سر تو اُٹھا —— اور دیکھ
کتنی دُور سے تجھ کو منانے آرہا ہوں میں
تجھے تیرے ہی کچھ قصے سنانے آرہا ہوں میں

ایودھیا! جانتا ہوں تیری مٹی میں اُداسی ہے

نہ جانے کتنی صدیوں سے
مری بھی رُوح پیاسی ہے
کہ ہم دونوں کی قسمت میں خوشی تو بس ذراسی ہے

بہت دن ہو گئے ہیں مجھ کو تیرے آسماں دیکھے
سنہری دھوپ دیکھے چم چماتی کہکشاں دیکھے
تری گلیاں، ترے بازار اور تیرے مکاں دیکھے
وہ دن جو تجھ میں روشن تھے وہ برسوں سے کہاں دیکھے
بچھڑ کر تجھ سے جو منظر بھی دیکھے رائیگاں دیکھے

مگر ہاں یاد آیا ——
ایک منظر اور بھی محفوظ ہے مجھ میں
حویلی ایک چھوٹی سی اور اس میں نیم کے سایے
کہ جس میں آج بھی زندہ ہیں شاید میری ماں جائے

اِسی منظر کے پیچھے اور بھی دھندلے سے منظر ہیں
پرانی گم شدہ تہذیب کے گھر میں
جہاں خوابوں کی دنیائیں
جہاں یادوں کے دفتر ہیں
اندھیرے روبرو میرے
ستارے میرے اندر ہیں

کہیں رادھا، کہیں سیتا، کہیں بیاکل سی میرا ہے

کہیں پر کربلا ہے اور کہیں پر رام لیلا ہے
ترا میرا تو شاید اَن گنت جنموں کا قصا ہے
کہ مجھ میں دُور ـــــــ
صدیوں دُور ـــــــ
گوتم اب بھی زندہ ہے

ہوا رک رک کے آتی ہے
جو گونجی تھیں ہزاروں سال پہلے
وہ صدائیں ساتھ لاتی ہے
مرے اندر جو میرے روپ ہیں
کو دکھاتی ہے

تیرے مرگھٹ کا باسی ہوں

پر
وہ
ذرا سی
کتنی دور
تجھے تیرے

ایودھیا! جانتا ہوں
نہ جانے کتنی صدیوں
مری بھی روح پیاسی
کہ ہم دونوں کی قسمت

بہت جی چاہتا ہے اب تری مٹی میں کھو جاؤں
کئی صدیوں کا جاگا ہوں
تری مٹی میں سو جاؤں

ایودھیا! میرا باہر: کربلا ہے
اندروں میرا: کپل وستو ہے، مکہ ہے مدینہ ہے
مجھے تیرے پرانے اور روشن دن میں جینا ہے
بدن پر ہے ترا بخشا ہوا یہ کیسری بانا
ہے بھکشا پاتر ہاتھوں میں
سفر میرا ہے اب تاریک راتوں میں

ایودھیا! سر اُٹھا
اور دیکھ لے مجھ کو
تھکے قدموں سے اب تیری ہی جانب آ رہا ہوں میں
سفر تاریک ہے
پگ پگ پہ ٹھوکر کھا رہا ہوں میں
مجھے آواز دے گھبرا رہا ہوں میں
تری خاطر جو برسوں سے چھپا رکھا ہے دل میں
وہ اُجالا لا رہا ہوں میں
ایودھیا!
آ رہا ہوں میں ——

ننھّی منّی خواہش

بزمِ مے آراستہ تھی
اور ہم تینوں نے مل کر اس قدر پی تھی
کہ جب تنہا ہوا میں ——— یاد آیا
مجھ سے اک دن ایک لڑکی نے کہا تھا :
میری خواہش ہے کہ تم مر جاؤ
اپنے گربھ سے پیدا کروں تم کو

مری خواہش تھی اس سے پوچھ لوں اتنا:
تمھارے گربھ سے پیدا اگر ہوں میں
تو جیسا چاہتی ہو مجھ کو تم ویسا بنا دو گی
تو کیا تم میرے سینے کے اندھیرے میں
سہانی دھوپ کا ٹکڑا سجا دو گی؟

مفرور

اس نے پچھلے کسی جنم میں
ناگ راج کا سر کچلا تھا
جنم جنم سے
ناگن اُس کو ڈھونڈ رہی ہے
جنم جنم سے
وہ خود سے چھپتا پھرتا ہے
اپنے ہی مردار بدن میں
ایسا کونہ ڈھونڈ رہا ہے
جس کے باہر، اُس کے لہو کی
گندھ نہ جائے
ناگن اُس کو ڈھونڈ نہ پائے

سچ کہتا ہوں :
جنم جنم سے
میں خود سے چھپتا پھرتا ہوں

دُور اس جزیرے سے

سنا ہے کہ جب اُس جزیرے کے سہ منزلہ جھونپڑوں پر اندھیرا اُترنے لگے گا
سبھی مشعلیں جل اُٹھیں گی
لباس اُس کا
اونچے درختوں تلے
دُور سے سرسراتا نظر آئے گا
اور کنارے پہ ٹھہری ہوئی میری کشتی
ہر پانیوں پر پھسلنے لگے گی

یہ میرے پرانے زمانے میں دیکھے ہوئے
چند خوابوں کا کوئی ادھورا ورق ہے
مجھے اس میں شک ہے

میں اک گمشدہ جسم کی وہ روپہلی چمک ہوں
جو سرسبز وادی کے گنجان پیڑوں میں جا کر

کہیں لاپتہ ہو گئی ہے
ہوا دھیمی رفتار سے چل رہی ہے
کنارے کی کشتی ہرے پانیوں پر
پھسلتی ہوئی
ایک بے سمت منزل کی جانب چلی جا رہی ہے

میں تنہا ـــــــ
کنارے کی نم ریت پر
اپنے بے روح ڈھانچے سے باہر کھڑا ہوں
اُداسی کی دلدل میں دھنستا چلا جا رہا ہوں

یہاں سے وہاں تک
کٹھور اور مغرور پانی کا سناٹا پھیلا ہوا ہے
بہت دُور ـــــــ
گہرے دھندلکوں میں لپٹا ہوا
اک جزیرہ نظر آ رہا ہے........

رات آنے پر

بچھڑے ہوؤں کے سپنے لے کر
جب میرے گھر رات آئے گی
چھاتی سے اسے لپٹا لوں گا
چھت پہ چمکتے سات ستارے
اس کی جھولی میں ڈالوں گا

منٹو

وہ روشن مکانوں کے تاریک گوشوں میں بیدار روحوں کی دوشیزگی ڈھونڈتا ہے
اسے میں نے سمجھا ہے : اتنی بڑی بات کہہ دینا
میرے لیے آج ممکن نہیں

وہ ادا کار ہے
اور اوڑھی ہوئی نت نئی کھال میں خود کو جیتا ہے
بیدار روحوں کی دوشیزگی کو جگاتا ہے
اور پھر اسی کھال میں اک دھماکے سے مرجاتا ہے

وہ مرا دوست ہے
زہر آلودہ لفظوں کے تاریک زنداں میں جولان پہنے ہوئے
سر کو ٹکراتے ، پتھر گراتے ہوئے
اس کو دیکھا ہے : روزن بناتے ہوئے

تم کہو گے کہ اس کو قضا کھا گئی
میں کہوں گا :نہیں
وہ جو اس کی زبان جانتے تھے انھیں سب کو نیند آ گئی

وہ مرا دوست ہے
وہ جہاں کل تھا اب بھی وہاں ہے
مگر سوچتا ہوں کہ کچھ تو ہے جو آج
نظروں سے سب کی نہاں ہے
کہ وا کھا کے اس پار، اُس پار کے درمیاں تو فقط
اب دھواں ہی دھواں ہے

کہیں دُور——— تاریک گوشے میں دُبکی ہوئی
زخمی دوشیزگی———
او سوگندھی———بتا!
وہ کہاں ہے؟

جو لوگ لوٹیں گے

پرانے شہر سے جب لوگ لوٹیں گے
مجھے پہچان لیں گے
مری گردن میں وہی زنجیر ہوگی
جو مجھے بخشی گئی تھی وقتِ پیدائش

میں کہہ دوں گا کہ میں خاموش ہوں اب تک
دکھا دوں گا لباسِ خوں چکاں اُن کو
شکستہ جسم و جاں اُن کو

پرانے شہر کے لوگو!
کبھی آؤ
مری دھرتی کی مٹی سے مجھے باہر نکالو
میرے ہونے کی گواہی دو
پرانے شہر کے لوگو!

نوحہ

سب کچھ ویسے کا ویسا ہے
ویسی ہی ٹھنڈی، میٹھی، گہری شامیں ہیں
ویسی ہی لمبی، جگمگ کرتی سڑکیں ہیں
ویسا ہی اُجلے اُجلے ہالے میں، اک کمرہ ہے، جس میں
ہم تم بیٹھے بالکل سایوں سے لگتے ہیں

ویسی ہی بوتل ہے، ویسے جام ہیں، ویسا ہی نشہ ہے
ویسا ہی جانا پہچانا اور گہرا ہے
ویسے ہی دھندلے دھندلے سارے منظر ہیں
ویسے ہی آباد سے، ویسے ہی بنجر ہیں

ویسے ہی قصے ہیں، جو ہم
اکثر سنتے اور کہتے ہیں
ویسے ہی دکھ سکھ ہیں اپنے

جو گھٹتے، بڑھتے رہتے ہیں
ویسی ہی باتیں ہیں، جن سے
بہت پرانی یادوں کی خوشبو آتی ہے
ویسی ہی ہے گھر گھر بکھری ہوئی خوشی، جو
ہم تک کبھو کبھو آتی ہے

ویسے کا ویسا ہے سب کچھ
سب کچھ ویسے کا ویسا ہے
نہیں ہے کچھ تو
وہ اک بدقسمت سایہ ہے
جو اس اُجلے اُجلے سے ہالے سے نکل کر
تاریکی کی گھور گھٹا میں
ڈوب گیا ہے

یاد کی لو

جب جل تھل پر گھور اندھیرا
پل پل بڑھتا جائے
دل کے گہرے جنگل سے
آواز تمھاری آئے
اور مرے گھر کے آنگن میں
دھوپ پھیلتی جائے

میراسین کے لیے

سہانی، نرم، خوابیدہ ہوائیں آرہی ہیں دُور اَن دیکھے پہاڑوں سے
مری آنکھوں کے آگے
پیرہن اُٹھتا ہے، گرتا ہے
تمھارا پیرہن ـــــ جس میں
تمھارے جسم کی خوشبو بسی ہے تیز، متوالی
سنہری، گمشدہ، کہنہ شرابوں سی
گھلی ہے آگ جس میں آفتابوں کی

تمھارا پیرہن اُٹھتا ہے گرتا ہے
اسے گرنے دو ــــ آؤ
اوڑھ لیں اک دوسرے کے جسم کو
اور ایسے رستے پر نکل جائیں
جسے اَن دیکھے منظر کی گھنی شادابیوں میں ڈوب جانا ہو

جہاں سے پھر کبھی واپس نہ آنا ہو

مری آنکھوں کے آگے
پیرہن اُٹھتا ہے، گرتا ہے
مجھے لگتا ہے صدیوں سے
میں اپنے جسم سے باہر کھڑا ہوں
اور اس کا منتظر ہوں
جس کو آنا ہی نہیں ہے میری راہوں میں
کہ جس کا جگمگاتا نقش ہے میری نگاہوں میں

سہانے دن تو جتنے تھے
میں اک اک کر کے سب کو گاڑ آیا ہوں
یہاں سے دور ——— صدیوں دور
اپنے گھر کے آنگن میں
کہ جن کا عکس بھی مجھ کو نظر آتا نہیں
چاروں طرف پھیلی ہوئی دھرتی کے درپن میں

تمھارا پیرہن اُٹھتا ہے، گرتا ہے
مری نظروں کے آگے اب
اُمنڈتا، شور کرتا ایک دریا ہے
اور اس کی وحشی لہروں پر رواں ہے ایک کشتی
جس میں اک تم، ایک میں ہوں
ہاں ——— سمٹ کر ایک ہیں دونوں

مگر یہ خواب ہے شاید ـــــ تمھارا پیرہن ہے
لرزشوں میں جس کی کھویا ہوں
میں کشتی ہوں ـــــ اکیلی دوڑتی
منہ زور لہروں پر
مجھے ساحل نہیں ملتا

مجھے آواز دو تم
نام سے اپنے پکارو اب
میں جو بھی لفظ لکھتا ہوں، تمھارا نام ہوتا ہے
مری ہر نظم کا آغاز اور انجام ہوتا ہے

مری نظروں کے آگے
پیرہن اُٹھتا ہے، گرتا ہے
کئی چہرے ہیں : ـــــ دھندلے
جن کی اب سنگت نہیں ملتی
محافظ تھی جو میری، سر پہ اب وہ چھت نہیں ملتی

تمھارا پیرہن ہے آج بھی میری نگاہوں میں
ستارے جس میں روشن ہیں
نہ جانے کون تھا وہ : ہو بہو تم سا
جو مجھ کو دُور سے اکثر بلاتا تھا
یہ پھیلا آسماں اس وقت کیوں دل کو لبھاتا تھا؟

مجھے آواز دو تم
نام سے اپنے پکارو اب
کہ اپنی دوڑتی کشتی کو دم بھر روک لوں
ساحل سے لگ جاؤں

میں سب رستوں پہ بکھرا ہوں
مجھے کوئی سمیٹو بھی
سہانی، نرم، خوابیدہ ہوائیں آ رہی ہیں دُور اَن دیکھے پہاڑوں سے
مجھے یکجا کرو
اِن کے ذرا نزدیک جانے دو
اور ان خالی خلاؤں میں
بدن کی دھجیاں مجھ کو اُڑانے دو
دھندلکے میں ستاروں کی طرح سے جگمگانے دو

رات

رات ـــــــ پیاری رات ـــــــ ناچ
چل رہی ہے آج یادوں کی پون ـــــــ اے رات ناچ
آسمانوں کی بہن ـــــــ اے رات ناچ

اے مری دیرینہ محبوبہ، مری دلدار ـــــــ ناچ
وحشیوں کے ہاتھ کی تلوار ـــــــ ناچ
اس زمیں کی سرحدوں کے پار ـــــــ ناچ

پربتوں پر ناچ، دریاؤں پہ ناچ
گلشنوں پر ناچ، صحراؤں پہ ناچ
دُور کے پھولوں بھرے مدھ بن میں ناچ
رات! میرے گھر، مرے آنگن میں ناچ

رات ـــــــ پیاری رات ـــــــ آ

چاند تاروں کی دُلاری رات

دو گھڑی اب درد کی محفل میں ناچ

رات!

میرے دل میں ناچ

غزل

اک پرانی بات جو اتنی پرانی بھی نہیں
کہہ سنانا بھی ہے مشکل اور چھپانی بھی نہیں
ہم کو اب رکھ دو کہیں بیکار سی شے جان کر
آتے اور جاتے ہوؤں کو جو دکھانی بھی نہیں
اب تو گالی کھا کے بھی ہم بے مزہ ہوتے نہیں
جسم ٹھنڈا پڑ چکا خوں میں روانی بھی نہیں
دن کے دامن میں نہیں ہے واقعہ کوئی نیا
رات کے آنچل میں اب کوئی کہانی بھی نہیں
آنے والے دن بھلا گزریں گے پاشی کس طرح
بیتے موسم کی تو اب کوئی نشانی بھی نہیں

وہ کا تعارف

وہ خود سے بے خبر نہیں ہے
اس نے اپنے سارے دن دیکھے ہیں
اس کی رات ستاروں والی
اس کی صبح اجالوں والی
پھر بھی وہ ظاہر کرتا ہے
اس کے جام ادھورے ہیں
اس دنیا میں کہیں پہ اس کے
بہت سے کام ادھورے ہیں
اس کی جیب میں جتنے دکھ تھے
اک اک کر کے
وہ لوگوں میں بانٹ چکا ہے
اب وہ بالکل
خالی خالی سا لگتا ہے
[اس کا دل اب لوہے کا ہے]

اس دنیا میں زندہ رہنا
اس کے لیے آسان ہوا ہے
اب وہ کسی مشین کی صورت
ہردم، ہر پل حرکت میں ہے
عجلت میں ہے

شاید وہ میرے سینے میں
چھالا تھا ———
جو پھوٹ گیا ہے
سچ پوچھو تو اس سے میرا
بہت پرانا رشتہ تھا
جو ٹوٹ گیا ہے

تو سنو.......

کبھی تم موڈ میں مجھ کو اگر پاؤ
تو پوچھو
میں بتاؤں گا : کہ میں اُس کو
سمندر کیوں نہیں کہتا——

یہ اُس کے زرد، خستہ کاغذوں میں درج ہے
سن لو——
کہ جب گپ چپ مکانوں میں
اندھیروں کی چڑیلیں دندناتی ہیں
تو خود کو نقش کر دیتا ہے وہ
اپنی بیاضوں میں

گھنے سایے جب اُس کو ہر طرف سے گھیر لیتے ہیں
نہتا جب وہ اپنے آپ کو محسوس کرتا ہے

تو وہ بتی جلا دیتا ہے
اپنے زرد، خستہ کاغذوں کی
باستانی بستیوں میں ڈوب جاتا ہے
جہاں پر سال بھر گرمی نہیں پڑتی
جہاں پر برف باری کے مناظر ہی
نگاہوں کو لبھاتے ہیں

وہ اپنا جائزہ
کچھ اس قدر نزدیک سے لیتا ہے
خود سے بھی کچھ آگے جا نکلتا ہے

کبھی تم موڑ میں مجھ کو اگر دیکھو
تو پوچھو
میں بتاؤں گا : کہ میں خود کو
سمندر کیوں نہیں کہتا ــــــ

گمشدہ لفظ

وہ جس کے شہر پہ سورج کبھی نہیں چمکا
میں اس سے جا کر پوچھوں گا
وہ کہاں گیا؟

وہ لفظ جو مجھ سے واقف ہیں
وہ لفظ جو مجھ سے جمے ہیں
ان لفظوں سے میں پوچھوں گا
وہ لفظ بتائیں گے مجھ کو
اس کی مٹی، جلتی بجھتی تصویر دکھائیں گے مجھ کو

اک شخص کہ جو نزدیک بھی تھا
اور دُور بھی تھا
اک شخص کہ جو مجبور بھی تھا

اک شخص جو شمع سے کی طرح
چپ چاپ سا شام کو جلتا تھا
اک شخص جو کچھ کچھ زندہ تھا
اک شخص کہ جس کو گہری کالی راتوں نے
برسوں تک خوب جگایا تھا
اک شخص جو خود کو دُور
کسی ویرانے میں رکھ آیا تھا

وہ لوگ کہ جن کے شہر ابھی تک کالے ہیں
وہ لوگ بتائیں گے مجھ کو
اک لفظ جو مجھ سے واقف تھا
وہ کہاں گیا؟

جاں نثار اختر کی موت پر

او عبدالماجد ہوتھرے

او عبدالماجد ہُوتھرے
ڈاچی سے اُتر ذرا
نہیں جلتی ریت ترے نیچے
ہے سبزہ ہرا بھرا

او عبدالماجد ہُوتھرے
منہ کھول کے دانت دکھا
یہ راز کھلے اندر تیرے
ہے کتنا زہر بھرا

او عبدالماجد ہُوتھرے
ترا باپ تھا بھائی مرا
او عبدالماجد ہُوتھرے
آ ـــــــ سینے سے لگ جا!

ہُوتھرے : سرائکی لفظ بمعنی : اُڈھنگ، فتنہ ساز

مرے آگے، مرے پیچھے

میں اپنے آپ کو جب آئینے میں دیکھتا ہوں
مجھ میں اک گہرا سمندر
سانس لیتا ہے
ہوا کچھ اس قدر نزدیک سے
چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے
کہ میں ہنستا ہوا اک پھول بن جاتا ہوں
پل بھر میں

مرے آگے، مرے پیچھے
کئی رنگوں کے بادل پھیل جاتے ہیں
مجھے موسم پرانے یاد آتے ہیں
کوئی سرسبز سی لڑکی
مری آنکھوں کو چھوتی،
دودھ گنگا سے اُبھرتی ہے

مرے صدیوں پُرانے دشت کی
صدیوں پرانی پیاس سے
جواب بھی ڈرتی ہے

مرے آگے، مرے پیچھے
جو پہلے پھول ہے
پھر رنگ
پھر رنگوں کا بادل
پھر سمندر ہے
وہ میری پرہوس آنکھوں کے اندر ہے

نکھری ستھری شاموں میں

بھوری بھوری شاموں میں، جب
ہم دو چار لفنگے، اپنی
مردہ، سوکھی، سخت نسوں میں
بھر لیتے ہیں گرم، کھولتا الکوحل
تب جی کرتا ہے :
بھاری بھرکم، نئی نویلی گالیاں دیں اُن لوگوں کو، جو
ہمیں پسند نہیں کرتے ——— یہ
زندہ رہنے کا اک طور تو ہو سکتا ہے
لیکن اس سے اپنے جی کا روگ مٹے
یہ ممکن کب ہے
[بے حس ہو کر جینا اس سے بہتر ہوگا]
اور پھر کیسے قائل کرو گے خود کو یارو: ہم روگی ہیں
روگی آخر کسی کو کیا دے سکتا ہے؟

اور مان بھی لیں یہ بات کہ ہم سچ مچ روگی ہیں
تب ہم اپنا روگ بھلا کیوں پھیلاتے نہیں ان لوگوں میں
جن سے ہم نفرت کرتے ہیں

کیوں آخر بھوری، نکھری، ستھری شاموں میں
ہم دو چار لفنگے مل کر
اپنے سوکھے، سڑے ہوئے مردہ جسموں کو
بھر لیتے ہیں گرم، کھولتے الکوحل سے
اِن نکھری، ستھری شاموں میں..............

جو بچھڑ گیا

ابھی ابھی تو محوِ گفتگو تھا وہ
ابھی ابھی تو میرے روبرو تھا وہ
ابھی مشاعرے میں وہ
سنا رہا تھا اک ہری بھری غزل
نئی نویلی سی، سجی دھجی غزل
کسی کی بدن دھوپ، روپ کی غزل
ابھی ابھی تو گھر میں تھا
ابھی ابھی تو زیست کے سفر میں تھا

ابھی ہیں اُس کے قہقہوں کی تتلیاں ہواؤں میں
ابھی تو اُس کا لفظ لفظ
سانس لے رہا ہے اِن فضاؤں میں

پورن کمار ہوش کی موت

ابھی ابھی تو تھا یہاں
ابھی ابھی تو جھک کے اس کو دیکھتا تھا آسماں

اے شامِ غم جواب دے
ابھی ابھی تو مل کے چل رہے تھے ہم
ابھی تو ایک ساتھ تھے؟

اُداسی کا دوسرا نام

1 :

سورج شہر سمندر
اندر : کس نے دیکھا؟
میں نے دیکھا ــــــ :
میں اپنے روشن، لمبے، گنجان کناروں سے بچھڑا
تنہا دریا ہوں
صدیوں صدیوں اپنے ہی اندر اندر بہتا رہتا ہوں

سورج شہر سمندر
اندر : ایک سماں ہے
دھم دھم دوڑتے لمحوں کے وحشی بیلوں کو
سفر سفر وشرام کہاں ہے
دُور دُور تک دھول دھواں ہے

کس صحرا میں اس کو ڈھونڈ وں
کس جنگل کی سمت میں اپنے قدم بڑھاؤں؟
کیوں نہیں اپنے پیر توڑ کر
سدھاندی کی خونیں لہروں میں بہہ جاؤں
اس کے نئے نویلے، گہرے شبدوں کا مطلب پا جاؤں

کمل منجری: میرے چرن پکڑ کہتی ہے :
دھوپ میں جلتی کھیتی ہوں میں
ساون کردے ——
مرے بدن کو پاون کردے

کمل منجری : جنم جنم کی پت جھڑ پیاسی
من میں جس کے گہری اور گھنگھور اُداسی
آگ کی لپٹوں بھرے، اجانے سے رستوں پر
بھاگ رہی ہے اوڑھ کے اپنا جسم کپاسی

کمل منجری! —— رُک جا
پل بھر کو دم لے لے
اپنے بدن کے غیر آباد علاقوں کو
بھل بھل جلنے دے
دن، دو دن جی کر بھی آخر کیا پالے گی

اگنی ماں کے شراپ سے گرتو بچ بھی گئی تو
جی نہ سکے گی —— وِش کھالے گی

کمل مخبری: سیدھی
میری بہن سریکھی
نین نقش کی روشن تیکھی

تُلسی کے پودے اتنی تھی ——
جب وہ ننھی، پریم میں ڈوبی
اِملی سی تیزابی کویتائیں لکھتی تھی
شام جب اس کی چھت سے اُتر کر
آنگن میں اپنے بالوں کو پھیلاتی تھی
وہ جیسے اندر سے گھائل،
گہری چِنتاؤں میں گم سم،
گھر سے دُور نکل جاتی تھی
سدھا ندی میں اپنا چہرہ دیکھتے : شومندر کے اک تنہا کونے میں
بیٹھ کے اپنی آنچ بھری، درد یلی کویتائیں گاتی تھی
باہر دھیمے دھیمے بہتی ہوئی سدھا بھی
آگ کی گہراتی لپٹوں میں ڈھل جاتی تھی

رُدرّ! ترے در پر آئی ہوں
اپنے نین کلش لائی ہوں
آنسو ن جل سے بھر دے

مجھ سے میری خوشیاں لے لے
اور بدلے میں
میرے نویں نکور بدن کو
دکھ سے نیلا کر دے
رُدرؔ! ترے در پر آئی ہوں
میری جھولی بھر دے

دُور دُور تک تیز ہوائیں
اس کی دکھ سے بھری صدائیں
لے جاتی تھیں
اور سکھ سیج پہ سوئے ہزاروں شانت دلوں کو تڑپاتی تھیں

اس کے سات سمندر ڈونگے
دُکھ کی میٹھی خوشبو پا کر
بہت دُور دیشوں سے
مُدرا گاؤں میں کتنے بھاٹ آتے تھے
اور تحفے میں
کمل مجری کی کویتائیں
دل میں باندھ کے لے جاتے تھے
اور اپنے دیشوں میں جا کر
گاؤں گاؤں میں بستی بستی میں گاتے تھے

اور سنا ہے : ایک بھاٹ نے

جس کا نام کمودراج تھا
اپنے دیش دُواپر پور کے
راج نگر میں
کمل مجری کا اک مندر بنوایا تھا
شام سویرے
جہاں ہزاروں لوگ آتے تھے
اور مندر میں چھائی اُداسی اوڑھ کے
اک انجانے سکھ کے پھیلاؤ میں کھو جاتے تھے

: 2

کتنی صبحیں ڈوب گئیں ساگر کی تہہ میں
کتنی شاموں کے چہرے تاریک ہو گئے
کتنی راتیں تاروں سے محروم ہو گئیں

چپ چپ جنمی کمل مجری
جیسے جیسے بڑھی ـــــ ابھاگن
اور بھی کچھ ویران ہو گئی
اپنے اندر دور دور تک
جلتا ہوا شمشان ہو گئی

جنمی تو دائی نے کہا تھا :
اسے رُلاؤ ـــــ
ورنہ ساری عمر ہنسی کو یہ ترسے گی
یہ وہ بدلی ہے جو بن ساون برسے گی
جنم کنڈلی بانچ برہمن کانپ گیا تھا
گویا اس کے آگے سانپ کا پھن پھیلا تھا
بولا : پچھلے جنم میں یہ سچ مچ بھٹنی تھی
روز اک نیا پتی کرتی تھی
رات جب آتی
یہ پھولوں کی سیج سجاتی
انگ انگ پر اُبٹن ملتی
اور جادو سے نازک بدن پری بن جاتی

اپنے لہو کی آگ بجھاتی

اور سحر سے پہلے
سیج پہ بیٹھے بیٹھے
اس کو اپنے بڑے بڑے ہاتھوں میں بھرتی
اور چپکے چپکے کھا جاتی

نیا جنم اس نے پایا تو
دکھ گہرے تھے
اس کی خوشیوں پر چتاؤں کے پہرے تھے
شیومندر کے رود تو صدیوں سے بہرے تھے

ماں کہتی: پورن ماشی ہے
اُٹھ کر کیسر جل سے نہا لے
تلسی پر اک دیا جلا لے
من پر چھائے گہرے اندھیارے کو مٹا لے
بھابھی کہتی : آ میں تیرے بال سنواروں
چوٹی کر دوں
تیری ستی ستی آنکھوں میں کاجل بھر دوں

سکھیاں کہتیں : چاند نکل آیا ہے
آ مدھوبن میں چل کر جھومر ڈالیں
دل میں اَن دیکھے ساجن کا خواب اُجالیں

لیکن کمل مخبری گم سم
گھر کے اک ویراں کونے میں
بیٹھ کے دیواریں تکتی تھی
پچھلے جنم کے اپرادھوں کے دکھ سہنا اس کی بھگتی تھی

گورے چٹے بھٹ کمود نے
چھپ چھپ کر اس کو دیکھا تھا
اس کی لہور لانے والی تیکھی کو بتاؤں کو سنا تھا
دل میں کمل مخبری کی خوشیوں کا رنگیں خواب بنا تھا

اک دن شرمیلے کمود نے جرأت کر کے پوچھا :
مجھ سے بیاہ کرو گی؟
کمل مخبری چونکی، بولی :
میں نے دکھ کو پتی کیا ہے
اب تک اسی کے سنگ جیا ہے
اور اسی کے سنگ مروں گی

تو کیا ساری دنیاؤں کے دکھ جھیلو گی؟
میرے حصے میں جتنی خوشیاں آئی تھیں
بانٹ چکی میں
دیکھوں بدلے میں اب کتنا دکھ ملتا ہے
تم کیا جانو

دکھ کو من میں چھپا کر کتنا سکھ ملتا ہے

اتنا تیاگ کسی نے اب تک نہیں کیا ہے
تم تو شیو سے بھی بڑھ کر ہو

میرا ایسا بھاگیہ کہاں، جو
اس سنسار کا سارا زہر مجھے مل جائے
گھر گھر، آنگن آنگن اک بگیا کھل جائے

کتنی صدیاں بیت چکی ہیں
دواپر پور ہے
اور نہ کمل مخبری کا وہ گم سم مندر
رنگیں سپنے بانٹنے والا بھٹ کمود بھی
مٹی کی تقدیر بن چکا
کمل مخبری لیکن، سچ، زندہ ہے اب بھی
چھتاؤں میں آشاؤں میں
مجھ جیسے کویوں کی لہو رلانے والی کویتاؤں میں

غزل

دشت میں جب یہ صدا دی کہ کہیں ہے کوئی
خاک نے اُٹھ کے کہا مجھ سے نہیں ہے کوئی
ذہن کہتا ہے کہ ہاں خاک ہوا شہر ترا
دل یہ کہتا ہے نہیں اب بھی یہیں ہے کوئی
کس کو ڈھونڈے ہے کوئی آج نواحِ دل میں
اس خلا میں نہ فلک ہے نہ زمیں ہے کوئی
آج بھی شہر میں ہے عشق سلامت میرا
آج بھی شہر میں تجھ سا ہی حسیں ہے کوئی
سچ کہ ملتا ہے سکوں آج بھی دل کو پاشی
اسی بستی میں جہاں خاک نشیں ہے کوئی

کرشن

سارے برہمانڈ میں جب کوئی بھی نہ تھا
سارے برہمانڈ میں کوئی ہوگا نہ جب
وہ کہ تھا اور وہ ہوگا
یہ لکھا ہوا آسمانوں میں ہے
اس کے فرمان میں، اس کی سب داستانوں میں ہے

جو ہواؤں میں ہے
جو فضاؤں میں ہے
وہ جو اونچا سبھی دیوتاؤں میں ہے
سارا برہمانڈ ہی
جس کی بانہوں میں ہے

اس جہاں میں جو گونجی تھی پہلے پہل
قبلِ روزِ ازل

از کراں تا کراں

تا بہ حدِّ گماں
اس کی آواز تھی
زندگی کا دھڑکتا ہوا ساز تھی

وہ کہ دیکھا گیا کونج گلیوں میں اور گوپیوں کے مدھر پیار میں
وہ کہ پایا گیا کال بن کر کبھی کنس دربار میں
وہ کہ جھونکا ہوا کا ہے اور سنسناتا ہوا تیر بھی
شاخِ گل بھی وہ اور شمشیر بھی

اس کا چرچا ازل سے بھی پہلے سے سارے جہانوں میں ہے
اس کا اک پاؤں دھرتی پہ
اور دوسرا آسمانوں میں ہے

وہ جو برہما بھی، وشنو بھی، شنکر بھی ہے
دوست بھی ہے، حریفوں کا لشکر بھی ہے
سیپ ہے جو کہیں تو چمکتا ہوا اک سمندر بھی ہے
جو پجاری بھی، پوجا بھی مندر بھی ہے
خیر و شر کا تماشا جو باہر ہے وہ اس کے اندر بھی ہے
وہ کہ اوجھل بھی ہے اور منظر بہ منظر بھی ہے

تیرگی سے اُبھرتا اُجالا ہے وہ

ایسی مالا ہے وہ
جس میں سارے ستارے، سبھی چاند سورج
ہیں منکوں کی صورت پروئے ہوئے
جس میں سیارے سب ہیں سموئے ہوئے
اپنے اپنے اندھیرے، اُجالے میں کھوئے ہوئے

وہ کنہیا بھی، جنسی بھی، رادھا بھی ہے
وہ کہ منزل بھی، راہی بھی رستا بھی ہے
رات بھی ہے وہ روشن سویرا بھی ہے
وہ حقیقت بھی ہے اور سپنا بھی ہے
سارے برہمانڈ نے اس کو دیکھا بھی ہے

اس کا وعدہ ہے :
جب جب بھی دھرتی پہ ظلم وتشدد بڑھے گا
وہ آئے گا
ہم قیدیوں کو چھڑا جائے گا
قید خانے کی دیوار ڈھا جائے گا
اس کا وعدہ ہے :
آئے گا وہ
اس کا وعدہ ہے وعدہ نبھائے گا وہ

ایک نظم: تمھارے لیے

تو سایہ ہے
جو میرا ہے
میں اک ایسا آئینہ ہوں
جس میں اک رنگین عکس ہے
جو تیرا ہے

تو ہے ستارہ
جو میرے گہرے اندھیاروں میں جلتا ہے
میں وہ سندر سپنا ہوں، جو
تیری آنکھوں میں پلتا ہے

میں وہ پیار کا نغمہ ہوں، جو
تری فضاؤں میں صدیوں سے

گونج رہا ہے
تو وہ خوشی کا لمحہ ہے، جو
روزِ ازل سے
مرے لیے اب تک زندہ ہے

میں وہ ٹھنڈی، نرم ہوا ہوں
جس کے لبوں پر
تیرے نام کی دھن رہتی ہے
اور تو سات سروں میں گاتی
اک ندی ہے
جو میرے اندر بہتی ہے

دور، میرے اندر

میرے اندر کہیں دور
گہرے گھٹاٹوپ جنگل ہیں
جن میں اب بھی دیکھا جاتا ہے کبھی کبھی
سبز کانٹے دار جھاڑیوں میں چھپا
اک بوڑھا آدم خور قبائلی
ناخن جس کے سڑ چکے ہیں
دانت جس کے جھڑ چکے ہیں
اور شکار جس کا
کوسوں دور ہے روشن آبادیوں میں
بوڑھا آدم خور قبائلی
میرا دوست

ایک مہیب سیاہ گدھ
ہر صبح اُس کے سرہانے

چھوڑ جاتا ہے کوئی انسانی لاش
بوڑھا آدم خور دن بھر میں
چاٹ لیتا ہے اسے
نیلگوں مردہ گوشت کو
اور پتھریلی زرد ہڈیوں کو گاڑ دیتا ہے
اپنے نیچے دھنسی زمین میں

ایک مہیب سیاہ گدھ : میرا دوست
اور میں : اک بوڑھا آدم خور قبائلی

غزل

رک کے دم لوں، کہیں ہوگا نہ شجر ایسا بھی
طے کروں گا میں کسی روز سفر ایسا بھی

دیکھ کر جس کو میں کھوبیٹھوں گا چہرہ اپنا
آئینہ میں کوئی آئے گا نظر ایسا بھی

چپ سی چھاجائے گی اک ایک مکاں میں یک لخت
بستیوں میں کبھی گونجے گا گجر، ایسا بھی

گھٹ کے مرجائیں، زمانے کو خبر بھی نہ لگے
دل میں خواہش ہے بنائیں کوئی گھر، ایسا بھی

زیست بھی آکے جگائے تو نہیں جاگوں گا
ہوگا اے دوست کوئی خوابِ سحر ایسا بھی

بھول جاؤں میں کہیں ہنستا ہوا گھر اپنا
کاش ایسا تو نہ ہو، ہوگا، مگر ایسا بھی

جس کو کچھ اپنا پتہ تھا، نہ زمانے کی خبر
تیری بستی میں تھا اک خاک بسر، ایسا بھی

گھر سے نکلے تو نہ پھر لوٹ سکیں گے پاشی
بیٹھ جائے گا دلوں میں کوئی ڈر ایسا بھی

تمھارے نام لکھتا ہوں

تمھارے نام لکھتا ہوں: ستارے، تتلیاں، جگنو
تمھارے راستے سیدھے بنیں
سایے ہوں ان پر جگمگاتے آسمانوں کے
کھلیں تم پر سہانے راز اَن دیکھے جہانوں کے
کہ آنکھوں میں تمھاری خواب ہوں اونچی اُڑانوں کے

تمھارے نام لکھتا ہوں : مسرت، آرزو، خوشبو
تمھارا ایک اک دن خوبصورت ہو، مثالی ہو
تمھاری کوئی بھی شب چاند تاروں سے نہ خالی ہو
سحر ہوتے جو تم اُٹھو
تمھارے سامنے پھیلے ہوئے گوشے ہوں پھولوں کے
جو رات آئے
تمھاری آنکھ میں سپنے ہوں جھولوں کے

تمھارے نام لکھتا ہوں وہ شہر خوشنما سارے
کہ جو دیکھے نہیں میں نے
تمھارے نام لکھتا ہوں وہ سارے خوبصورت لفظ
جو لکھے نہیں میں نے

تمھارے نام اُجلی صبح، رنگیں شام لکھتا ہوں
بقا کا جام لکھتا ہوں
جو لمحے سکھ کے حاصل ہیں مجھے وہ سب تمھارے نام لکھتا ہوں
تمھارے نام لکھتا ہوں

جب دھوپ کھلے گی

آنے والے دن کتنے اچھے ہوں گے
نرم اُجالوں والی دھوپ کھلی ہوگی
آنگن میں ہم سب مل کر بیٹھے ہوں گے
دور قطاروں میں چڑیاں اُڑتی ہوں گی
آنکھوں میں کل کے سندر سپنے ہوں گے
دور دیس جانے والے اپنے ساتھی
ڈھول بجاتے گھر واپس آتے ہوں گے

اردھانگنی کے نام

تمھارے نام لکھتا ہوں:
ستارے، تتلیاں، جگنو

پیش لفظ

اس مجموعے میں شامل سبھی نظمیں میں نے اپنی اردھانگنی کے بارے میں لکھی ہیں اور یوں اس کتاب کا نام 'اردھانگنی کے نام' رکھا گیا ہے۔

یہ نظمیں کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نہیں لکھی گئیں بلکہ وقتاً فوقتاً میں نے اپنی اردھانگنی کے بارے میں جو محسوس کیا اسے لفظوں میں ڈھال دیا۔ یہ عمل گذشتہ کئی برسوں سے جاری ہے بلکہ اپنے شعری سفر کی ابتدا ہی سے، لیکن اس کا احساس مجھے کچھ برس پہلے ہوا جب میں لندن میں تھا۔ ایک شام جب میں بالکل تنہا تھا تو نہ جانے کیوں بار بار بیوی کی یاد آئی۔ جی چاہا کسی طرح اُڑ کر اپنے گھر پہنچ جاؤں لیکن دلّی اور لندن کے درمیان کتنے سمندر، کتنے دریا، کتنے پہاڑ حائل تھے۔ اس شام بغیر کسی کاوش کے دو نظمیں ہوگئیں۔ بعد میں جب میں نے اس موضوع پر سوچا تو مجھے معلوم ہوا کہ میری شاعری میں میری بیوی کے عکس شروع ہی سے موجود ہیں۔

جب میں ان لفظوں کو ان کے شاعر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک عام قاری کی نظر سے دیکھتا ہوں تو مجھے ان نظموں کے جھروکوں سے جھانکتی ایک ایسی عورت دکھائی دیتی ہے جو ایک مثالی ہندوستانی عورت ہے جس کا وجود اپنے خاوند، بچّوں اور گھر سے جڑا ہوا ہے۔ جس کے گلے میں منگل سوتر ہے جو اُس کے سہاگ کی نشانی ہے اور جو نہ صرف اسی روپ میں زندہ رہنا چاہتی ہے بلکہ اسی روپ میں مرنا بھی پسند کرتی ہے :

گلے میں تیرے
اسی طرح
یہ منگل سوتر سہاتا رہے
تیرے سہاگ کے گیت
ہمیشہ گاتا رہے

اس عورت کے کئی روپ ہیں ـــــ یہ بچی ہے، بہن ہے، بیوی ہے، ماں ہے اور ان سب سے بڑھ کر جانے مانے اُردو شاعر میراجی کے لفظوں میں یہ ایک ایسا ستون ہے جس سے گھر کی چھت قائم رہتی ہے۔ ودیاپتی اور دوسرے شرنگاررس کے شاعروں نے عورت کو صرف ایک عورت کے روپ میں پیش کیا ہے جو سیج پر سجنے اور سجانے کے کام آتی ہے لیکن ہندوستانی عورت صرف سیج کی چیز نہیں بلکہ دفتر سے رسوئی اور رسوئی سے بستر تک اُس کے کئی روپ ہیں اور اس کا ہر روپ عورت کا ایک مثالی رُوپ پیش کرتا ہے:

سارے موسم
سارے منظر
سب تہوار
سبھی تقریبیں تم سے ہیں
سارے مذہب تم سے جنمے
سب تہذیبیں تم سے ہیں

دراصل عورت سارے مذاہب اور تہذیبوں کی خالق ہی نہیں بلکہ وہ بذاتِ خود ایک تہذیب ہے ایک ایسی تہذیب، جو کل بھی زندہ تھی، آج بھی ہے اور کل بھی اِس تہذیب کا زوال نہیں ہو سکتا ـــــ یہ تو ایک ایسی ندی ہے جو ازل سے بہہ رہی ہے اور اَبد تک یونہی بہتی رہے گی :

ندی
تراسنگیت امر ہے
میرے کانوں میں بھر دے
ہاں ہاں
مجھے اَمر کر دے

میں نے اپنی اردھانگنی کو عورت کے اِسی مثالی کردار میں دیکھا اور پایا ہے، اس کا ایک روپ یہ ہے :

تو ہے گھٹا برسنے والی
میں ہوں بدن بھگونے والا

صبح
جو پھول اٹھا کر سونگھے
کسی میں خوشبو نہ اپنی تھی
خوشبو ترے بدن کی تھی

تو ایک روپ یہ بھی ہے :

یہ یُگ تو پت جھڑ کا یُگ ہے
تو بسنت رُت کی نشانی ہے
گمبھیر، وشال، مقدس تو

تجھ میں گنگا کی روانی ہے
آکاش سے بھی پہلے کی تو
تو دھرتی سے بھی پُرانی ہے

اس مجموعے میں شامل نظمیں سیدھی سادی اور عام فہم زبان میں ہیں شاید سیدھے سچے محسوسات کے اظہار کے لیے ایسی ہی زبان کی ضرورت تھی۔

یہ ایک بڑی اَدبی تخلیق نہ سہی لیکن اِن نظموں میں دل کا خلوص شامل ہے اور جو بات خلوص دل اور فن کارانہ ایمانداری سے کہی جائے، شاید اسی کا نام شاعری ہے۔

نئی دہلی
7 رجنوری 1986

کمار پاشی

آکاش میں تارے ہیں
رادھا ہو کہ میرا ہو
سب روپ تمھارے ہیں

نظمیں

1

جب تو نہیں رہے گی
تب بھی
تیری سانسیں
سارے بھومنڈل میں ہوں گی

جب میں نہیں رہوں گا
تب بھی
میرے لفظ
تری خوشبو کو لے کر
محفل محفل میں گھومیں گے
اور تجھے زندہ رکھیں گے

2

اک کویتا لکھوں :

تیری ماں پر

تجھ کو ہے جس نے جنم دیا

اک کویتا :

تیرے بابل پر

تجھے جس نے مجھ کو سونپ دیا

اک کویتا :

تیرے بھیا پر

تجھے جس نے بٹھایا ڈولی میں

اک کویتا :

تیرے بچّوں پر

جو سب کے سب تجھ جیسے ہیں

اک کویتا لکھوں گا :
میں خود پر
تو جس کے لیے سنورتی ہے

3

اک تیرے لیے
میں نے،
پرکاش!
کچھ رنگ چھپا کر رکھے ہیں

کچھ شبد
جو سب سے میٹھے،
سب سے سندر ہیں
سب کے سب میرے اندر ہیں

اِن رنگوں سے
اِن شبدوں سے
تیری تصویر بناؤں گا
جس روپ میں تجھ کو دیکھا ہے
وہ روپ میں تجھے دکھاؤں گا

4

میں تجھ کو آکاش لکھوں گا :
جس میں چاند ستارے ہیں

لکھوں گا ساگر :
جس کی تہہ میں
سیپوں اندر موتی ہیں

لکھوں گا پربت :
جس کے اوپر
گورے، چٹے بادل ہیں

تجھ کو سُوا پتن لکھوں گا :
جو سب بجھی بجھی آنکھوں میں
دیے کی لو سا جلتا ہے

سو یہ لکھوں گا :
جو میرے مَن کے ساگر میں ڈھلتا ہے

5

ندی
جہاں سے چلی تھی تُو
میں بھی تیرے ساتھ چلا تھا
تیرے ساتھ مجھے چلنا ہے
جہاں تلک تو جائے گی

ندی
مجھے اپنی لہروں پہ بہائے چل
نئے نئے منظر آنکھوں کو دکھائے چل

ندی
ترا سنگیت امر ہے
میرے کانوں میں بھر دے
ہاں، ہاں
مجھے امَر کر دے

6

نیند ہی نیند میں
میرے ہاتھوں میں
چاند آ گیا
ایک بادل
کہ بادل سے ٹکرا گیا ———

نیند ہی نیند میں
سارا کمرہ چمکنے لگا
لونگ تیرا دمکنے لگا

رات بھر ———
پیار کی دیویاں
گیت گاتی رہیں

کانچ کی چوڑیاں

نیند ہی نیند میں
رات بھر
کھنکھناتی رہیں

7

دن کا گرم اُجالا ہو
یا رات اندھیری کاجل ہو
رنگ اُڑاتا سورج ہو
یا نقش بناتا بادل ہو
دھوپ، سنہری میٹھی ہو
یا نرم ہوا کا آنچل ہو

جیون کے اس رستے میں
جتنے بھی منظر آئے
تیرے عکس نظر آئے

8

ہولے ہولے پھول گرے
کچھ پلکوں پر،
کچھ ہونٹوں
کچھ رخساروں پر

جہاں پھول گرا
وہاں پھول بنا
پھر پھولوں کی اک سیج بنی
اور سیج پہ سندر پھول کھلے

اک پھول تھا میرا
اک اس کا
پھر دونوں میں کوئی بات ہوئی
پھر رات ہوئی

ہولے ہولے
ہم دونوں پر
پھر کرنوں کی برسات ہوئی
ہر رات ہوئی

9

پھول چنبیلی کے

جب تیرے جوڑے میں تھے
ان کی خوشبو اپنی تھی

رات گئے
جب کھل گیا جوڑا
پھول بکھر گئے :
تکیے پر
کچھ بستر پر

صبح ـــــ
جو پھول اٹھا کر سونگھے
کسی میں خوشبو نہ اپنی تھی
خوشبو ترے بدن کی تھی

10

تو میری بانہہ پہ سر رکھ کر
یونہی سوئی رہے
رات آئے
آ کے چلی جائے
پھر رات آئے ـــــــ
یونہی راتیں آتی جاتی رہیں
تری پلکوں کو سہلاتی رہیں

میں یونہی ـــــــ
اپنی بانہہ پسارے پڑا رہوں
تو بال بکھیرے
اُس پر اپنا سر رکھ کر
یونہی سوئی رہے

مجھے نیند نہ ایک بھی پل آئے

ترے خوابوں میں
پر کاش!
نہ کوئی خلل آئے

11

رنگ
روشنی
سیج پہ کلیاں، پھول اور ابرق
کیسر کے چھینٹے
تیرے میرے
کپڑوں پر

اگر بتی کی خوشبو سے
مہکا ہوا کمرہ

لمبی اور انجانی باتیں
کچھ جانی، پہچانی باتیں
سندر اور سہانی باتیں

رات وہ——

سب راتوں کی رانی
تیرے میرے دل میں
کبھی نہ ہوگی
جس کی یاد
پرانی

12

تجھے جب جب پڑھا ہے میں نے
نئے اَرتھ کھلے ہیں مجھ پر

جب پہلی بار پڑھا تھا
میری آنکھوں کے آگے
منظر اک نیا سجا تھا

پچھلے پچیس برس میں!
تجھے جتنی بار پڑھا ہے
تیرا ہر ارتھ نیا ہے

ترے گیت سنانے والا
پرکاش! میں ترا کوی ہوں
تو نت نئے ارتھوں والی
شاید کہ مری کویتا ہے

13

تجھ کو نہ کبھی کوئی دیکھ سکے
تجھ کو نہ کبھی کوئی سونگھ سکے
تجھ کو نہ کبھی کوئی بانچ سکے

تجھ پر
بہار کا سایہ رہے
تری ایسی کی ایسی ہی کایا رہے

14

اگر سچ پوچھ
تو اتنا کہوں گا :
تجھے کھویا ترے نزدیک آ کر
تجھے پایا ہے،
تجھ سے دُور جا کر

تو بادل ہے،
ہوا ہے،
تو سمندر
کہ جو کچھ تا حدِّ امکاں ہے
وہ سب دیکھتا ہوں :
تیرے اندر ———

سرے ہاتھوں
مرے خوابوں میں تو ہے

مری آنکھوں

مری سانسوں میں تو ہے

تو جتنی دور ہے

نزدیک تر ہے

میں ہوں تیرا مکیں

تو میرا گھر ہے ——

تو سورج ہے

تو چندا

تو ستارا

جہاں پر بھی ہے تو

دم سے ترے ہر سو اجالا

مری صبحوں میں تو

میری شبوں میں

کہ ہے موجود تو سب راستوں میں

نہ گل سے جس طرح

خوشبو الگ ہے

نہ میں تجھ سے

نہ مجھ سے تو الگ ہے

15

کل
ہولی میں
سب کے سامنے
تجھ سے رنگ
نہیں کھیلوں گا

جب سب دوست
چلے جائیں گے
تنہائی میں
تب گلال سے
تیرے ورکش ستھل پر
اپنا نام لکھوں گا

اور اس برس بھی
اپنے بدن کا
تھوڑا رنگ
تجھے دے دوں گا

16

تو آئے گی
تو میں تجھ کو دکھاؤں گا :
عجب منظر ——
سہانی رات کا منظر

تری زلفوں میں
تارے ٹانک دوں گا
تیرے ماتھے پر
سجا دوں گا
سہانے چاند کا ٹیکا
پہنا دوں گا
تجھے میں
چاندنی کی اوڑھنی
اور پھر شاید
تجھے نشہ پلا دوں گا

محبت کا
میں تیرے جسم کی خوشبو سے
بھومنڈل کو بھر دوں گا
سہانی رات کے
پھیلے اُجالے میں
تجھے تحلیل کر دوں گا

17

اک رات ہو :
گہری اور لمبی ـــــــ
اک چاند ہو :
ٹھنڈا اور میٹھا ـــــــ
کچھ تارے،
جگمگ کرتے
اپنے سر پر ہوں ـــــــ

اور ایسے میں
ہم دونوں :
کہیں سفر پر ہوں

18

چل کہیں ——
جنگلوں میں چلیں
ایسے جنگل ——
جو دل کو لبھاتے ہیں
اور دور تک ——
نرم اور ہلکے ہلکے
اندھیروں میں
کھو جاتے ہیں ——

ایسے جنگل،
جنھیں ——
ہم نے دیکھا ہے صدیوں سے
صدیوں سے
ہم نے جہاں
جنم اپنے گزارے ہیں

اب بھی جہاں
ہلکے ہلکے اندھیرے ہیں
جگ مگ ستارے ہیں
جو سب
ہمارے ہیں——

19

میں تجھے لپیٹ کے سوجاؤں
ترے آنگن میں
مری دھوپ سجے
تری چھت پر
میرا چاند کھلے
مرے گرم اُجالے دور تلک
ترے اندھیاروں پر
سایہ کریں
ہر صبح تجھے
ہر سانجھ تجھے
چھوں اور ——
ڈھونڈنے جایا کریں
تجھے باندھ کے
ریشمی کرنوں کی زنجیروں میں
مری سیج پہ

ہر شب
لایا کریں
اور تجھ پر گہری
لمبی ——
ست رنگی نیندیں
برسایا کریں

20

یہ گھنے ، سہانے موسم
یہ لمبے، سیدھے رستے
یہ اونچے، چوڑے پربت

یہ ہنستی، گاتی ندیاں
یہ دھوم مچاتے دریا
یہ شانت اور گہرے ساگر

یہ میٹھا ، بہتا پانی
سب کہتے ہیں تری کہانی

21

تو ہو پاس تو یوں لگتا ہے
سب کچھ اُجلا اُجلا سا ہے

میں ہوں مور گھنے جنگل کا
تو کالی گھنگھور گھٹا ہے

میں اک دھوپ میں جلتا پودا
تو باغوں کی شانت ہوا ہے

یہ جگ دُکھ سے بھری کہانی
تو میٹھا سندر سپنا ہے

یہ جیون اک کھیت ہے سوکھا
تو ساون رُت کی برکھا ہے

تو ہے پھولوں کا گل دستہ
تو خوشبوؤں کا رستا ہے

22

اک پھول جو اپنا ہے
یہ جیون رات کڑی
تو سندر سپنا ہے

اک باغ کا رستا ہے
تری انگلیاں چھونے کو
ہر پھول ترستا ہے

آکاش میں تارے ہیں
رادھا ہو کہ میرا ہو
سب روپ تمھارے ہیں

برہا میں ستاتا ہوں
تنہائی میں جب تم کو
سینے سے لگاتا ہوں

23

تو گیت بنے :
تجھ کو میں گاؤں گا

تو پھول بنے :
ترے رنگ چراؤں گا

تو بدلی بنے :
میں پیاس بجھاؤں گا

تو نیند بنے :
تجھے آنکھوں میں بھر کر سو جاؤں گا
پل ہی پل میں
دنیا بھر کے
سب سکھ پا جاؤں گا

24

مرے واسطے کوئی کچھ نہیں
مرے واسطے تری ذات ہے
تو جو دن کہے تو میں دن کہوں
تو کہے جو رات، تو رات ہے
مرے واسطے............
یہی وادیاں، یہی باغ ہیں
یہی زندگی کے سراغ ہیں
یہی جگمگاتے چراغ ہیں
تو جہاں تلک مرے سات ہے
مرے واسطے............
کسی راستے بھی چلے ہیں ہم
یہ اُجالے دل کے ہوئے نہ کم
یہی روشنی ہے قدم قدم
یہی چاندنی کی برات ہے
مرے واسطے............

25

تیری مانگ کا
یہ سندور چمکتا رہے

تیرے ماتھے کی
یہ بندی
یونہی جگمگ کرتی رہے

تیرے ہاتھوں کی
یہ چوڑیاں
جھنک جھنک کرگاتی رہیں

تیری ناک کے لونگ کا نگ
یوں ہی لشکارا دیتا رہے

گلے میں تیرے

اسی طرح
یہ منگل سوتر سہاتا رہے
تیرے سہاگ کے گیت
ہمیشہ گاتا رہے

26

سب کچھ بدلا بدلا سا تھا

دھوپ میں ویسی تپش نہیں تھی
چاندنی میں وہ بات نہیں تھی
اُس دن ویسی صبح نہیں تھی
اُس دن ویسی رات نہیں تھی
سچ مچ وہ سارے دن جھوٹے
جب تو میرے سات نہیں تھی

27

میں تجھ سے بہت ڈرتا ہوں
تو مجھ سے بچھڑ جائے گی
مرے پاؤں تلے
پتّی پتّی
پھولوں کی بکھر جائے گی

خوشبو
جو بہت دن پہلے سے
شاید کہ کئی صدیوں سے
میرے سنگ سنگ چلتی ہے
کسی موڑ پہ مر جائے گی

آنکھوں کو جلانے والا دھواں
ہر سو ہوگا تب
جہاں تلک ——
میری یہ نظر جائے گی

28

کچھ سکوں اب ـــــــ
نہ یاروں کی صحبت میں ہے
کچھ نہ لذّت
نئی یا پرانی شرابوں میں ہے
کچھ نہ دلچسپی
اب شاعری کی
کتابوں میں ہے

دل کا گوشہ ہے اپنا
جو ویران سا
شہر سارا ہی
لگتا ہے سنسان سا

آسماں کچھ نہیں ـــــــ
یہ زمیں کچھ نہیں
تو نہیں ہے اگر،
تو کہیں کچھ نہیں ـــــــ

29

موسم
پہلے بھی آتے تھے
موسم تو
پھر بھی آئیں گے
موسم تو
آتے رہتے ہیں
گھر گھر
آنگن آنگن میں
گاتے رہتے ہیں

لیکن وہ دن کیسا ہوگا؟
جس دن
سارے موسم
ملنے ہم سے
ہمارے گھر آئیں گے
اور بن ملے
چلے جائیں گے ——

30

موت سے مجھ کو
ڈر لگتا ہے
سوتے سوتے اکثر
نیند اُچٹ جاتی ہے
موت کی بھتنی
مجھ کو
کھانے آ جاتی ہے

ایسے میں
میں بڑھ کے
تجھ سے
لپٹ جاتا ہوں

یوں لگتا ہے
تو ساگر ہے

اور میں
ساگر کی لہروں پر
خود کو
سرگھشت سا پاتا ہوں
آنکھیں موندے
بس چپ چاپ
بہا جاتا ہوں

31

بس اتنا کچھ ـــــ
یہی اک کمرہ
یہی سب چیزیں
یہی سب بچے
یہی سب خوشیاں
یہی سب دُکھڑے
یہی اک تو ہو
اور ہر شے میں
تری خوشبو ہو

32

یہ جیون دھوپ بھرا دن ہے
اور تو اک شام سہانی ہے
یہ یگ تو پت جھڑ کا یگ ہے
تو بسنت رُت کی نشانی ہے
گمبھیر، وشال، مقدس تو
تجھ میں گنگا کی روانی ہے
آکاش سے بھی پہلے کی تو
تو دھرتی سے بھی پرانی ہے
ترے اندر مرا فسانہ ہے
مرے اندر تری کہانی ہے
جس بات سے تجھ کو دُکھ پہنچے
ہر بات وہ تجھ سے چھپانی ہے

تو ساتھ تو جگ مگ سب رستے
تو نہیں تو خاک اُڑانی ہے

33

تو سایہ ہے
جو میرا ہے
میں اک ایسا آئینہ ہوں
جس میں اک رنگین عکس ہے
جو تیرا ہے

تو ہے ستارا
جو میرے گہرے اندھیاروں میں جلتا ہے
میں وہ سندر سپنا ہوں، جو
تیری آنکھوں میں پلتا ہے

میں وہ پیار کا نغمہ ہوں، جو
تری فضاؤں میں صدیوں سے
گونج رہا ہے

میں وہ ٹھنڈی، نرم ہوا ہوں
جس کے لبوں پر
تیرے نام کی دھن رہتی ہے
اور تو سات سروں میں گاتی
اک ندی ہے
جو میرے اندر بہتی ہے

34

وقت وہی سب سے اچھا، جو
ساتھ ترے گزرا ہے
بن تیرے، مت پوچھ
کہ مجھ پر
کیا کچھ بیت گیا ہے

سورج چاند میں تجھ کو دیکھا:
دیکھا تجھے ہوا میں
تیرے رنگ نظر آئے
ہر دھرتی، ہر دریا میں

لیکن پھر بھی
سب شہروں میں
شہر وہی اچھا ہے

جو تیرا میرا ہے
اور اس شہر کے سبھی گھروں میں
سچ وہی اچھی ہے
جس پر تو سوئی ہے
اور نیندوں میں
مجھ کو
دُور سے آتا دیکھ رہی ہے ———

لندن: 1982ء

35

یہ شہر بڑا زمودی ہے
مجھے بار بار آپ اپنے کو
یہ یاد دلانا پڑتا ہے
اس شہر کی لمبی دوری پر
سپنوں میں مرے تو کھوئی ہے

یہاں اتنے تیز اُجالے ہیں
جو چہرے دیکھے بھالے ہیں
اُن پر اب دھند کے جالے ہیں

رفتہ رفتہ
میں خود کو بھولتا جاتا ہوں
اب کس سے پوچھوں
تو ہی بتا :
یہ سوچ کے کیوں گھبراتا ہوں

میں پل پل تجھ سے
دُور کھسکتا جاتا ہوں

لندن: 1982ء

36

برٹش میوزیم میں
میں نے کل
ایک مورتی دیکھی تھی
سونے کی بنی
کئی ہزاروں سال پرانی
اس کے تھنبوں
اور اروجوں
لمبے کیشوں
اور آنکھوں میں
سات رسوں کی
مستی دیکھ کے
میں فوراً پہچان گیا تھا
سوا تمھارے
اور کون ہو سکتی تھی وہ

37

کہیں دور سے
مجھ کو آواز دے
جانی پہچانی
لیکن پرانی سی آواز میں
تو مرا نام لے کر بلا
میرا صدیوں پرانا کوئی نام
تیرے سوا
جس کو کوئی نہیں جانتا

دور گوکل کی گلیوں سے
آواز دے
وہ جو باہر تھا میرے کبھی
میرے اندر دکھا
میرا کوئی پرانا سا منظر دکھا

38

میرے دیش کے
سارے شہر تمھارے ہیں
وہ جو دھرتی کے نیچے
خاموش پڑے ہیں
وہ جواب
جگ مگ کرتے ہیں
اور وہ بھی
جو آنے والے دنوں میں
دھرتی سے جنم لیں گے
وہ سب شہر تمھارے ہیں

سب شہروں کی ساری کتھائیں
سارے موسم
سارے منظر
سب تہوار

سبھی تقریبیں تم سے ہیں
سارے مذہب تم سے جمے
سب تہذیبیں تم سے ہیں

39

کس نام سے تجھے بلاؤں میں!
ترے نام ہیں لاکھوں یاد مجھے

ہر یگ میں تجھ کو پایا ہے
ہر یگ میں تجھ کو چاہا ہے
تو ایک
مگر ترے نام کئی
تیری اور میری کتھاؤں کے
آغاز کئی، انجام کئی

ترے نام کی خاطر جنمی ہیں
سب بھاشائیں
ساری لپیاں
سارے اکھشر

اک نام ہے لیکن ایسا بھی
جو دیے کی لو سا جلتا ہے
دھیمے دھیمے
دل کے اندر

40

بیس برس کی راتیں پاشی
کتنی لمبی ہوتی ہیں
بیس برس کی صبحیں
دوپہریں اور شامیں
گنتے گنتے
اپنی انگلیاں تھک جاتی ہیں

بیس برس میں
کتنے موسم آتے ہیں
کتنی بہاریں
کتنے پت جھڑ
کتنے ساون
گنتے گنتے پچ جانو
یہ انگلیاں دُکھنے لگ جاتی ہیں

بیس برس کا ساتھ ہے اپنا
بیس برس کا لمبا عرصہ
کیسے گزرا
ایک پلک جھپکی ہو جیسے
ابھی تو ہم نے اک دوجے کو
جی بھر کے دیکھا بھی نہیں ہے

کتنی بہاریں
کتنے پت جھڑ
کتنے ساون
آنے والے ــــــ
لمبے سالوں میں آئیں گے
لیکن اس کے بعد بھی ہم تم
شاید اک دوجے کو
جان نہیں پائیں گے

شادی کی 20ویں سالگرہ پر

41

ہم نے اپنے جسم پہ
کتنی لمبی راتیں جھیلی ہیں
ہم ہی یہ بتلا سکتے ہیں
ساگر میں کتنے موتی ہیں
کن ہاتھوں میں جیوتی ہے
اس دنیا میں
ساری ٹھنڈی، نرم ہوائیں
اپنے گھر سے چلتی ہیں

اپنے گھر میں ——
میں ہوں، تم ہو
اور ہماری نازوں پالی
پانچ چہکتی چڑیاں ہیں

اک اک کر کے

پانچ ستارے
اپنے گھر کی چوکھٹ پر
اُجلی چاندی پھیلائیں گے

اک اک کر کے
پانچوں چڑیاں
ساتھ اپنے لے جائیں گے
اور ہمیں
اک میٹھی میٹھی
تنہائی دے جائیں گے

42

جب تو
اپنی ماں کی ساڑی میں ہوتی ہے
بالکل
اپنی ماں جیسی لگتی ہے

جب جب
پپی بھی
میکے میں
تیری ساڑی میں ہوتی ہے
بالکل تجھ جیسی لگتی ہے

جگیا سا بھی
بڑی ہو کر جب
پپی کی ساڑی میں ہو گی
بالکل پپی جیسی ہو گی

یعنی تیرے اسی روپ کو
آگے آنے والے یگ میں
جگیاسا زندہ رکھے گی
تجھے کبھی مرنے نہیں دے گی

43

میں نے
آئینے میں
اب تک
خود کو
کبھی نہیں دیکھا ہے
یعنی میں کیا جانوں
میں کیسا لگتا ہوں ــــــ

ششی!
اپنے ننھے راہل کو
تو میری بانہوں میں دے دے
اس کی آنکھوں میں
جھانکوں تو ــــــ
سامنے میرے
مرا کوئی منظر آ جائے

شاید مجھ کو
اپنے چہرے کا
کوئی نقش
نظر آجائے

44

جی چاہتا ہے :
تری آنکھوں میں
پرچھائیں نہ دکھ کی پاؤں میں

جی چاہتا ہے :
تری پلکوں پر
جھلمل تاروں کو سجاؤں میں

جی چاہتا ہے :
ہر روز تجھے
کوئی خوشی کی خبر سناؤں میں

45

تین دن
اور تین راتیں
میں کسی کی قید میں تھا

ہاتھ میرے تھے مگر میرے نہیں تھے
پاؤں میرے تھے مگر میرے نہیں تھے
ذہن میرا تھا مگر میرا نہیں تھا

تین دن
اور تین راتیں
کیوں نہ اپنی زندگی سے نوچ کر
گہرے سمندر میں گرا دوں

تین دن اور تین راتیں
چھپ کے تیری چھاتیوں میں

نیند، گہری نیند میں سویا ہوں
اتنا یاد رکھوں
اور سب باتیں بھلا دوں

46

ایشور نے
کچھ کام
اچھے بھی کیے

مثلاً
اندھیرا مٹانے کے لیے
آکاش کی کھونٹیوں پر
چاند اور تارے لٹکا دیے

مثلاً
پیاسی دھرتی کے ہونٹوں پر
رم جھم بوندیں برسانے کے لیے
اونچے، لمبے پربت بنا دیے

مثلاً

جہاں بہت سے
ریگستان بنائے
وہاں بیچوں بیچ
ایک دریا بھی بہادیا

ایشور نے سچ مچ
کچھ کام
اچھے بھی کیے

مثلاً میرے لیے
اس سنسار میں
تمھیں بھیج دیا

47

تمھارے نام لکھتا ہوں :
ستارے، تتلیاں، جگنو
تمھارے راستے سیدھے بنیں
سایے ہوں اُن پر جگمگاتے آسمانوں کے
کھلیں تم پر سہانے راز
اَن دیکھے جہانوں کے
کہ آنکھوں میں تمھاری
خواب ہوں اونچی اُڑانوں کے

تمھارے نام لکھتا ہوں :
مسرت، آرزو، خوشبو
تمھارا ایک اک دن خوبصورت ہو، مثالی ہو
تمھاری کوئی بھی شب
چاند تاروں سے نہ خالی ہو

سحر ہوتے جو تم اُٹھو
تمھارے سامنے پھیلے ہوئے گوشے ہوں پھولوں کے
جو رات آئے
تمھاری آنکھوں میں سپنے ہوں جھولوں کے

تمھارا نام لکھتا ہوں :
وہ شہر خوش نما سارے
کہ جو دیکھے نہیں میں نے

تمھارے نام لکھتا ہوں :
وہ سارے خوب صورت لفظ
جو لکھے نہیں میں نے

تمھارے نام
اجلی صبح، رنگیں شام لکھتا ہوں
بقا کا جام لکھتا ہوں
جو لمحے سکھ کے حاصل ہیں مجھے
وہ سب تمھارے نام لکھتا ہوں
تمھارے نام لکھتا ہوں———

48

کاش! تو میری ماں ہوتی
اور تو نے مجھ کو
اپنے گربھ سے
پہلا جنم دیا ہوتا

پہلا جنم
نہ جانے کب اور
کہاں لیا تھا میں نے
مجھ کو یاد نہیں ہے

پہلا جنم تھا میرا
یا پھر تیرا
آنے والے وقتوں میں رہنے والوں کو بھی
شاید معلوم نہ ہوگا

لیکن میں تو کہہ سکتا ہوں
آنے والے
کسی بھی لمحے میں
جب تو مجھ سے بچھڑے گی
یہ جگ مگ سی
سندر کائنات
اسی لمحے اُجڑے گی

49

مجھے اِس جنم میں
ماں نے
فقط اک بار ہی
پیدا کیا
لیکن
تمھارے گربھ سے
میری تمھاری
بچیوں کے روپ میں
اس جنم میں
کئی بار جنما ہوں

50

جب جب بھی میں
جنم نیا لوں ـــــــ
تیرے نام کا پہلا اکھشر
میرے کانوں میں گونجے

جب جب بھی میں
جنم نیا لوں ـــــــ
شہد میں قلم ڈبو کر
کوئی
میری کوری
پیاسی زبان پر
تیرا سندر نام لکھے
چاہت کا پیغام لکھے

51

خود میں تجھے سمونے والا
تجھ سے جدا نہیں ہونے والا

تو ہے پھول کھلانے والی
میں ہوں ہار پرونے والا

تو ہے گھٹا برسنے والی
میں ہوں بدن بھگونے والا

میری مٹھی میں تارے ہیں
آج نہیں میں سونے والا

تو سب سے انمول ہے سچ مچ
تجھے نہیں میں کھونے والا

چاند چراغ

فہرست

گفتگو ——————— مصنف ———————

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ محمور سعیدی ———————

نظمیں ———————————————

غزلیں ———————————————

گفتگو

گذشتہ دو دہائیوں میں انسان نے مادی آسائشوں کے حصول کی خاطر اخلاقی زوال کی طرف جس تیزی کے ساتھ پیش رفت کی ہے، اس کی مثال پوری انسانی تاریخ میں مشکل سے ملے گی، لگتا ہے ہماری نسوں میں اب خون نہیں دوڑتا بلکہ اس کی جگہ گاڑھا، گدلا کیچڑ رینگ رہا ہے۔

موجودہ سیاسی نظام اور مفاد پرست سیاسیین نے انسان کو چھوٹے چھوٹے ہزار گروہوں میں بانٹ کر آپسی رنجشوں اور نفرتوں کی بظاہر کبھی نہ بجھنے والی آگ میں دھکیل دیا ہے اور اب اس آگ میں ہماری قدیم ملی جلی تہذیب اور کلچر کا چمچماتا لباس بھل بھل کرتا ہوا جل رہا ہے۔

میں گذشتہ کئی برسوں سے گہرے عذاب میں ہوں۔ مجھ جیسا خواب پسند انسان کورے کاغذ پر ایک خوب صورت اور حسین دنیا کا نقشہ بنانا چاہتا ہے لیکن ہر صبح کا اخبار میرے گھر کے آنگن میں بندوق کی گولیوں سے چھلنی لاشیں بچھا دیتا ہے۔ علی الصبح میرے کانوں میں مسجد کی اذان یا مندر کی گھنٹیوں کی میٹھی مقدس آواز نہیں آتی بلکہ بموں کے دھماکے اور بے گناہ انسانوں کی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔

میں واقعی بڑا بدنصیب ہوں کہ اپنی شاعری کو اس کرب سے پوری طرح محفوظ نہیں

رکھ سکا۔ صورتِ حال بڑی ہولناک ہے اور بظاہر کسی خوشگوار تبدیلی کے آثار نہیں نظر آتے لیکن میں خواب پسند انسان کسی خوش آئند دنیا کا تصور کیے بغیر کیسے رہ سکتا ہوں؟

نئی دہلی ——— کمار پاشی

30؍جولائی 1991

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

مومن کی موت پر غالب نے نبی بخش حقیر کو ایک خط میں لکھا تھا کہ مرحوم سے میرے چالیس برس کے دوستانہ تعلقات تھے۔ چالیس سال پرانا دوست تو کیا دشمن بھی کسے نصیب ہوتا ہے۔

میرے اور کمار پاشی کے درمیان دوستانہ مراسم بھی اتنے ہی پرانے تھے۔ درمیان میں ایسے موقعے بھی آئے جب ہم آپس جھگڑ پڑے لیکن ایک دوسرے سے جو تعلق خاطر تھا اس میں کبھی کمی نہ آئی۔

میں نے فروری 1953 میں اپنے آبائی شہر ٹونک کو خیرباد کہا اور دہلی آ گیا۔ دہلی میں شروع شروع جن لوگوں سے دوستیاں قائم ہوئیں ان میں کمار پاشی بھی تھا جس کی شاعری کا وہ ابتدائی دور تھا۔ ہماری پہلی ملاقات دہلی پبلک لائبریری کے ہال میں منعقدہ ایک شعری نشست میں ہوئی تھی۔ اس سے پہلے میں اس سے واقف نہیں تھا۔ جب اس کا نام پکارا گیا تو اس نے ''شام'' کے عنوان سے ایک نظم پڑھی۔ مجھے اس نظم نے چونکا دیا۔ نئی لفظیات، نئی اپروچ اور نئی تعبیرات۔ نشست کے بعد ہم دونوں میں علیک سلیک ہوئی اور یہاں سے ہم دونوں کے درمیان اس قربت کا آغاز ہوا، جو آگے چل کر اولاً دہلی کے ادبی حلقوں میں اور پھر پوری ادبی دنیا میں ایک ضرب المثل بن گئی۔

کچھ وقفے کے بعد میں ماہنامہ ''تحریک'' کے ادارتی عملے میں شامل ہو گیا جس کے مالک

اور مدیر اردو کے پختہ کار صحافی اور شاعر گوپال متل تھے۔ اُن دنوں ادب میں ترقی پسندی کا بول بالا تھا۔ اردو کے اکثر ادیب اور شاعر یا تو ترقی پسندوں کے ساتھ تھے یا اُن سے مرعوب اور خوفزدہ ''تحریک'' ترقی پسندی کے رَد اور مخالفت میں نکالا گیا تھا۔ اس لیے بہت سے قلمکاروں کو اس کی قلمی معاونت میں تامل تھا۔ یہ ''تحریک'' کے بالکل ابتدائی دور کا ذکر ہے اور اس دور میں جن لوگوں نے اس کی طرف دستِ تعاون بڑھایا اُن میں پاشی بھی تھا جسے گوپال متل سے متعارف کرانے والا میں تھا۔ ''تحریک'' میں پاشی کی جو پہلی نظم شائع ہوئی وہ وہی تھی جو اُس نے دہلی پبلک لائبریری کی مذکورہ بالا شعری نشست میں پڑھی تھی۔

کمار پاشی کا پہلا شعری مجموعہ ''پرانے موسموں کی آواز'' تھا۔ اس کی اشاعت کے ساتھ ہی ہمعصر اردو شاعری کے منظر نامے میں ایک ایسے رنگ کا اضافہ ہوا جو دوسرے رنگوں سے مختلف ہی نہیں منفرد بھی تھا۔ پاشی کی نظمیں اپنی لفظیات، اسلوب اور موضوع ہر اعتبار سے توجہ طلب تھیں۔ تکنیک کی سطح پر کسی حد تک وہ میرا جی سے متاثر نظر آتے تھے جس کا بعض مبصرین نے ذکر بھی کیا لیکن یہ اثر پذیری کوری تقلید یا نقالی سے کوئی نسبت نہیں رکھتی تھی۔ میرا جی کی شاعری کا بنیادی محرّک جنسی ناآسودگی کا احساس اور ان کے فکر و خیال کا محور مرد اور عورت کا جسمانی تعلق ہے جو انھیں اپنی گرفت سے بہت کم باہر نکلنے دیتا ہے۔ کمار پاشی کو جنس کے موضوع سے بھی دلچسپی تھی لیکن اس کا اصل ذہنی شغف انسان کے تاریخی اور تہذیبی کردار کے ساتھ تھا۔ تہذیب کے حوالے سے ان کی جذباتی وابستگی ہندوستان کے عہد قدیم اور اس کی پروردہ روایات کے ساتھ تھی۔

کمار پاشی کا دوسرا شعری مجموعہ ''خواب تماشا'' تھا۔ اس مجموعے کی اشاعت کے ساتھ کمار پاشی کی فکر کا ایک اور پہلو سامنے آیا۔ اس وسیع و عریض کائنات میں جو ازل سے ابد تک پھیلی ہوئی ہے چند سانسوں کے مہمان انسان کی حیثیت کیا ہے یا اُس انسان کے لیے جو چند سانسوں کا مہمان ہے خود یہ کائنات کیا حیثیت رکھتی ہے؟ غالب نے دنیا کو بازیچۂ اطفال کہا تھا لیکن کمار پاشی اسے ایک ایسا تماشا قرار دیتا ہے جو خواب میں دیکھا جا رہا ہو۔ غالب پھر یاد آئے۔ یہ بھی تو انہی نے کہا ہے :

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

''خواب تماشا'' کے بعد جس میں پاشی کی نظم ''گندے دنوں کا قصہ'' بھی شامل تھی اس کی ایک طویل نظم ''ولاس یاترا'' کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ اس نظم کا پیش لفظ بلراج کومل نے لکھا تھا اور انھوں نے اپنے پیش لفظ کو ایک ایسے قلعے کو سر کرنے کی ناکام کوشش قرار دیا تھا جس کے دروازے پوری طرح ان پر وا نہ ہو سکے۔ اوپر میں نے پاشی کی نظم ''گندے دنوں کا قصہ'' کا ذکر کیا ہے۔ ''ولاس یاترا'' دراصل اس نظم کی توسیع تھی۔

''گندے دنوں کا قصہ'' اور ''ولاس یاترا'' یہ دونوں نظمیں پاشی کے اس احساس کی ترجمان ہیں کہ جب ایک تہذیب دوسری تہذیب پر غالب آتی ہے تو اس کی پاکیزگی کو مجروح کرتی ہے۔ ہم ان دونوں نظموں کو دو حوالوں سے سمجھ سکتے ہیں : دراوڑ تہذیب پر آریاؤں کی یلغار یا پھر آریہ اقتدار پر ان مسلمانوں کا حملہ بن جن میں سامی اور آریائی اثرات گڈمڈ ہو گئے تھے۔

کمار پاشی چالیس برس تک میری خلوت وجلوت کا، یا میں اس کی خلوت وجلوت کا شریک رہا ہوں۔ بہت سے موقعے ایسے آئے جب ہم ایک دوسرے کے سامنے اپنی معنوی وجود کے ساتھ ننگے ہو گئے اگر اس صورتِ حال کا کوئی مطلب ہے تو میری اس گزارش کو قبول کر لیجیے کہ پاشی کے لیے مذکورہ بالا دونوں تاریخی واقعے ناخوشگوار تھے اور وہ انھیں ایک غیر پاکیزہ عمل سمجھتا تھا۔ فراق کا بہت مشہور شعر ہے :

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

ہمارے ناقدین کرام اس شعر کو جس چوکھٹے میں رکھ کر اس کی تعریف وتحسین کرتے رہیں، یہ شعر اُس چوکھٹے میں اپنے پورے ابعاد کے ساتھ نہیں سماتا، اس کی چھوٹ ایک تہذیب کے ساتھ دوسری تہذیب کی ہم بستری تک پہنچتی ہے، میرا دوست کمار پاشی اس ہم بستری کے جواز کا قائل نہیں تھا۔

میرا حافظہ شاید مجھے دھوکا دے رہا ہے۔ ''ولاس یاترا'' سے پہلے کمار پاشی کا ایک مجموعہ ''انتظار کی رات'' شائع ہوا تھا۔ پاشی کے ہر مجموعے کا نام معنی خیز ہے ''انتظار کی رات'' میں وہ نسل آدم کے اس نجات دہندے کا منتظر نظر آتا ہے جس کا انتظار ہر دور کے نیک دل انسانوں کو رہا ہے۔ یہ نجات دہندہ کون ہوگا، پاشی اس بارے میں ہمیں وضاحت یا تفصیل سے کچھ نہیں بتاتا لیکن مجملاً ہمیں اس کے خط وخال سے اپنی مخصوص استعاراتی زبان میں متعارف ضرور کرادیتا ہے اور یہ خط وخال آسمانی نہیں، ارضی ہیں۔ ملکوتی نہیں، انسانی ہیں۔

پاشی کو چیلنج قبول کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔ اس کی نظموں کا اتنا چرچا ہوا کہ لوگوں نے اسے صرف نظم گوشاعر سمجھ لیا حالانکہ اس نے غزلیں اور رباعیاں بھی کہی تھیں۔ اس نے اپنا ایک مجموعہ ''روبرو'' شائع کیا جو صرف غزلوں پر مشتمل تھا۔ اس مجموعے کی اشاعت کے بعد لوگوں نے ایک غزل گو کی حیثیت سے بھی اس کی قدروقیمت پہچانی اور اس کا نام اہم غزل گوشعرا میں آنے لگا۔

''روبرو'' کے بعد کمار پاشی کے اردو رسم الخط میں دو مجموعے اور شائع ہوئے۔ ''اک موسم مرے دل کے اندر اک موسم مرے باہر'' اور ''زوالِ شب کا منظر'' اول الذکر اس کی نئی تخلیقات پر مشتمل تھا اور ثانی الذکر اس کے سابقہ مجموعوں کے انتخاب پر۔

کمار پاشی کا ایک مجموعہ دیوناگری رسم الخط میں بھی شائع ہوا۔ ''اردھانگنی کے نام'' یہ گھر آنگن کی شاعری تھی اور اس میں اس نے اپنی بے اعتدالیوں کی معذرت کی تھی۔ اس مجموعے کا اجرا ہندی کے مشہور ناقد پروفیسر نامور سنگھ نے کیا تھا۔ میں بھی اس جلسے میں شریک تھا۔ نامور سنگھ نے کہا تھا کہ اگر چہ یہ نظمیں دیوناگری میں چھپی ہیں لیکن مزاجاً یہ ہندی کی نظمیں نہیں اُردو کی نظمیں ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پاشی یہ سن کر خوش نہیں ہوا تھا کیونکہ اس نے یہ نظمیں اپنی دانست میں ہندی میں کہی تھیں۔

کمار پاشی ایک ہمہ جہت تخلیقی شخصیت کا تھا۔ اس نے شعر گوئی کے علاوہ افسانے اور ڈرامے بھی لکھے اور یہاں بھی اپنی انفرادیت قائم رکھی۔ جن لوگوں نے اس کے افسانوں کا مجموعہ ''پہلے آسمان کا زوال'' اور ڈراموں کا مجموعہ ''جملوں کی بنیاد'' پڑھا ہے، وہ میرے خیال سے اتفاق کریں گے۔

کمار پاشی اعلیٰ تنقیدی شعور کا بھی حامل تھا۔ اس نے ''سطور'' کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ نکالا تھا جسے آج بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اس رسالے میں اس نے مختلف ادبی مسائل پر جو اظہار خیال کیا، اس کا وزن و وقار اُس وقت بھی محسوس کیا گیا تھا، اب بھی محسوس کیا جا رہا ہے اور آئندہ بھی کیا جاتا رہے گا۔

کمار پاشی غیر منقسم ہندوستان کی ایک ریاست بھاولپور میں پیدا ہوا تھا۔ تقسیم وطن کے بعد وہ اپنے خاندان کے ساتھ جے پور آیا اور پھر اپنے خاندان کے ساتھ ہی دہلی آ بسا۔ یہیں اس کی ادبی سرگرمیوں کا آغاز ہوا اور یہیں اس نے زندگی کی آخری سانس لی۔ اس کی تاریخ پیدائش 3 جولائی 1935 تھی اور 17 ستمبر 1992 کی صبح کو اس نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ یعنی صرف 57 سال کی عمر پائی۔ وہ موت کے تصور سے بہت خائف تھا، قدرت نے اُسے اس خوف سے اس طرح نجات دلائی کہ وہ جب تک ہوش میں رہا پوری طرح تندرست اور توانا تھا۔ دفتر کا کام ختم کر کے گھر جا رہا تھا کہ راستے میں بیہوش ہو کر گرا اور پھر ہوش نہیں آیا۔ یہ 16 ستمبر کی شام کا واقعہ ہے، رات بھر وہ بیہوش رہا اور 17 ستمبر کی صبح کو جے پرکاش نرائن اسپتال کے ڈاکٹروں نے جہاں وہ آفس سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز تھا یہ اعلان کر دیا کہ مسٹر شنکر دت کمار اب ایک ڈیڈ باڈی ہیں۔ اس کا دفتری نام یہی تھا۔ اس کی موت پر میر کا یہ مقطع بے ساختہ یاد آتا ہے :

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

——— مخمورؔ سعیدی

نظمیں

دریا

دریا دریا ـــــــ
دریا میری چوکھٹ پر آ
میں پیاسا ہوں
روزِ ازل سے
بادل میری چھت پر کبھی نہیں اُترا ہے

میں اک ایسا دشت
جدھر سے
شاید کوئی نہیں گزرا ہے

دریا ـــــــ
میری چوکھٹ پر آ
بڑھ کر مجھ کو گلے لگا لے
میری صدیوں صدیوں پرانی آگ بجھا دے

کل یگ

سویرا جارہا ہے———
آسمانوں سے :
پھسلتی آرہی ہے شب

یہ شب ہر چھت پہ اُترے گی
ہر اک آنگن میں ننگے پاؤں گھومے گی
ہر اک روزن، ہر اک کھڑکی
ہر اک دَر سے
مکانوں میں گھسے گی
ہر سو تاریکی بچھا دے گی

سویرا جارہا ہے اب
برہنہ تن
شکستہ پا

لہو سے تر
سویرا جا رہا ہے ——
اس کو جانے دو
یہ شب اپنے گناہوں کی سزا ہے
اس کو آنے دو

مجھے انسانی گوشت بہت مرغوب ہے
میں اک بوٹی روز چباتا ہوں
اپنوں اور پرایوں کے خوں میں
وہ نشہ ہے
دو اک گھونٹ بھی پی لوں
تو کھل جاتا ہوں
تاریکی اچھی لگتی ہے
دن نکلے گھبراتا ہوں
کسی سے اچھی خبر اگر میں سن لوں
تو ڈر جاتا ہوں
کسی کا مرنا، کسی کا رونا
مجھ کو بہت سہاتا ہے
بُرا سا منظر دیکھ کے مجھ کو
سچ مچ
لطف آ جاتا ہے

دل میں ایک شجر ہوتا تھا
گھنا سا: سایہ دار شجر
جس کے سبز سہانے
پتوں میں چھپ کر
چڑیاں نغمے گاتی تھیں
مجھ کو وجد میں لاتی تھیں

دل میں اک دریا ہوتا تھا
ہولے ہولے بہتا ہوا
اور اپنی موجوں کی زباں میں
میرے ہرے بھرے ماضی کی
کوئی کہانی کہتا ہوا
لیکن اب اس دل میں
کوئی شجر، نہ کوئی دریا ہے
چار طرف اک صحرا ہے
تیز ہوائیں دُور دُور تک

ہردم گرد اڑاتی ہیں
اک اک کر کے
مجھ سے میرے
سارے سمندر موسم چھینے جاتی ہیں

متھرا

متھرا، متھرا ——

تم میری کیا لگتی ہو؟

تم سے میرا کیا رشتہ ہے؟

گوکل کی گلیوں سے پوچھو،

اور بتاؤ :

پہلا حرف کہاں گونجا تھا؟

وہ پہلی آواز

سنا تھا

جس کو اس برہمانڈ نے

لاکھوں صدیوں پہلے

دیکھ رہا ہوں :

دُور کدم کے

سبز، سہانے پیڑ ہی پیڑ نظر آ۔تے ہیں

شام سے
گئیوں کے سنگ گوالے جیسے گھر آتے ہیں
صدیاں گزریں
لیکن اب بھی گوالا اپنے گھر نہیں آیا
رادھا کا دلبر نہیں آیا

ہر دہلیز پہ آج یشودھا
اُس کا رستہ دیکھ رہی ہے
صدیوں بعد بھی
دُور سے جیسے
اُس کو آتا دیکھ رہی ہے

وہ ہے ایک اکیلا
اُس کے روپ ہزاروں
دنیا میں جتنے بھی ہیں
سب نام ہیں اس کے
سب آغاز ہیں اس کے
سب انجام ہیں اس کے
یہ بحر و بر اس کے
سحر و شام ہیں اس کے

یہ پربت یہ جنگل اس کے
آسمان پر بادل اس کے

یہ لہروں کے آنچل اس کے
سب ظاہر، سب اوجھل اس کے
وہی نہیں اک
لیکن اس کا رچا
یہ سب سنسار وہی ہے
ہر منظر اس پار وہی، اُس پار وہی ہے
قدم قدم پر
آج بھی اتیار چار وہی ہے
سوئے ہوئے ہیں سب
لیکن کہتے ہیں :
اس سارے برہمانڈ میں
آج بھی اک بیدار وہی ہے
آج بھی اس کی ہنسی کی دھن
صبح کی میٹھی کرنوں سے
چھن کر آتی ہے
آج بھی، ہم کو اندھیاروں کی
فوج سے لڑنا سکھلاتی ہے

لفظ نہیں بولتے

سنا یہی ہے
کہ لفظ اب بولتے نہیں ہیں
جو مجھ پہ اب تک گزر چکا ہے
گزر رہا ہے
وہ لفظ در لفظ مر رہا ہے
میں ہر طرف سے
مرے ہوؤں میں گھرا ہوا ہوں
کبھی کبھی میں
ڈرا ڈرا سا
سبھی کو چپ چاپ دیکھتا ہوں
کبھی کبھی سر اُٹھا کے مردے
اور اس آنکھوں سے
دیکھتے ہیں :
میں موت کی وادیوں میں جیسے اُتر گیا ہوں
کہ جیسے میں آج مر گیا ہوں

مٹھی کھول

چاروں طرف اندھیرا ہے
اور اُس کی مٹھی میں جگنو ہیں
میں کہتا ہوں :
مٹھی کھول
مٹھی کھول، اجالا ہوگا
سب بولے : وہ منظر دیکھنے والا ہوگا

وہ کہتا ہے :
مٹھی کھول
آسمان پر چاند
نہ کوئی ستارا ہے
چاروں طرف اندھیارا ہے

''لیکن میرے ہاتھ میں تو انگارا ہے''

بیمار دنوں میں

میں اپنے بیمار دنوں میں
ایک ہی بات کہا کرتا ہوں
رات بہت ہی گہری کالی ہو سکتی ہے
اور میں لمبی چادر تان کے سو سکتا ہوں
سورج اندھا ہو سکتا ہے
چاند ستارے سارے
سچ مچ
اک اک کر کے بجھ سکتے ہیں

لیکن میرے اندر
جو ننھا سا ایک دیا روشن ہے
اُس کے اجلے سائے کبھی نہیں مر سکتے
جگ میں گھور اندھیرا کبھی نہیں کر سکتے

کوئی رات لمبی نہیں

کہیں بھی کوئی رات لمبی نہیں ہے
یہ مانا ـــــــ
ترے اور مرے درمیاں فاصلہ بے کراں ہے
دھواں درمیاں ہے
دلوں میں مگر اپنے دوری کہاں ہے
یہاں سے وہاں
تا بہ حدِّ گماں
گھپ اندھیرا اگر حکمراں ہے
ترا امتحاں ہے
مرا امتحاں ہے
نہ گھبرا سحر سب پہ سایہ کرے گی
سحر سب کی ماں ہے

کوئی تنہا نہیں

کوئی تنہا نہیں ہوتا
کوئی سورج کوئی تارا
سبھی کے ساتھ چلتا ہے

سفر میں ساتھ چلتا ہے
کوئی رستہ کوئی سایہ
کوئی دریا، کوئی صحرا
کوئی تنہا نہیں ہوتا

کوئی شیشہ ، کوئی پتھر
کوئی جگنو، کوئی آنسو
سبھی کے ساتھ چلتا ہے
سفر میں زندگی کے ہر
قدم پر ساتھ چلتا ہے

میں پوچھوں گا

میں ساگر سے پوچھوں گا
میں ندیا سے پوچھوں گا
میں دریا سے پوچھوں گا

میرے موتی کہاں گئے؟
میرا بچپن کہاں گیا؟
مری جوانی کہاں گئی؟

تو ہی بتادے اب آکر
دل میں جو میرے رکھی تھی
تری نشانی کہاں گئی؟

اسے تارا کہو

اُسے تارا کہو ————
وہ روشنی دے گا
اُسی کی حکمرانی ہے
زمینوں، آسمانوں کے اُجالوں پر
کہ وہ سایہ فگن ہے
مسجدوں پر، مندروں پر اور شوالوں پر
اُسے تارا کہو
وہ چھت پہ اترے گا
اُسے تم پیار سے آنگن میں لے آؤ
کلیجے سے لگا لو تم
وہ روٹھا ہے منا لو تم
اسے تارا کہو ————
تارا ————

سات جزیروں والی عورت

نوریں نکور بدن والی وہ اُجلی عورت
سات جزیروں پر قابض تھی

رات اُس کی زلفوں پر
سر رکھ کر سوتی تھی
سورج اُس کی پلکوں کے در کھول کے
چپکے چپکے سے
باہر آتا تھا
اور اس کی ساتوں سرسبز زمینوں پر
ہولے ہولے سے
دُور دُور تک
دھوپ کی چادر پھیلاتا تھا

پھول اس کی آواز کو سن کر کھل جاتے تھے

جس جانب وہ چل دیتی تھی
اُسے اجالوں والے رستے مل جاتے تھے
اُس کے دریاؤں میں میری آنکھ کھلی تو
سات جزیروں پر وحشی بادل چھائے تھے
سات جزیروں والی پگلی!
کیا جانے، کس اندھی دنیا سے آئے تھے

اُس میں چڑھتے دن کا اجالا
مجھ میں گہری رات نہاں تھی
چڑیا سی وہ بھولی بھالی
اس میں اتنی سوچ کہاں تھی
اُس کے گوشت کو اوڑھے تھا میں
وہ عریاں تھی
جی ہاں ——— سچ ہے
سات جزیروں والی عورت
میری ماں تھی ———

دھواں دھواں سے مناظر نہ کوئی شخص نہ عکس
اب آئینے بھی دکھاتے ہیں حیرتیں کیسی

میں اچھی لڑکی ہوں

پاپا ــــــــ میں ترے گھر کی باندی

میں نے اپنے سترہ برس میں
گڑیوں سے کم دن کھیلا ہے
میں نے تو بس سترہ برس تک
تیرے گھر کا چوکا برتن صاف کیا ہے

اِن ہاتھوں سے چھو کر تجھے جگاتی تھی میں
رات کا بھوجن سب کو کھلا کر
بچا کھچا کچھ کھاتی تھی میں

ممّی پاپا، بھائی اور بہنوں کے سوا تو
میری ان آنکھوں نے کسی کو
آج تلک دیکھا بھی نہیں ہے

تیرے گھر کی ڈیوڑھی کے باہر تو اکیلے
میں نے قدم رکھا بھی نہیں ہے
میں کیا جانوں
مرا پڑوسی کون ہے پاپا!
سچ مچ روز سحر نے مجھ کو
چوکے چولہے میں دیکھا ہے

رات بھی مجھ کو
چوکے میں مصروف دیکھ کر سو جاتی تھی
تیرے گھر کی دیواروں سے باہر پاپا کب جاتی تھی
کیا جانوں اس جنم میں میں نے
کون سا ایسا پاپ کمایا
سترہ برس تک تو نے مجھ کو
میرے ہر لمحے میں دیکھا
پھر بھی مجھے تو سمجھ نہ پایا

تو ابھی مانی ہے یہ سچ ہے
میں بھی تو ابھی مانی پاپا کی بیٹی ہوں
دیکھ مجھے میں ـــــــ تیری خاطر
اگنی ماں کے
سندر، شیتل میٹھے شعلوں میں لپٹی ہوں
پاپا ـــــــ
میں اچھی لڑکی ہوں

نیا سال

365 دنوں کی یادیں پھر میری پیاسی جھولی میں ڈال گیا ہے
اپنے آخری چاند کو لے کر
اور اک سال
نہ جانے کس گہرے پاتال گیا ہے

سمے کے ساگر گھٹ سے پاشی
ایک برس یوں بیت گیا ہے
جیسے صدیاں بیت گئی ہوں

پیچھے ——
بہت ہی پیچھے
صدیوں کا لشکر ہے
منظر کے پیچھے منظر ہے
دھرتی ماں کی بھولی بیٹی

اگنی پریکشا دینے کو تیار کھڑی ہے
آگ کی لپٹوں کے پیچھے بھی
آگ کی گہراتی لپٹیں ہیں

دیکھ رہا ہوں: اگلے برس میں
لاکھ چتا میں
لاکھوں نربل سیتاؤں کے
کومل جسموں کی پیاسی ہیں
یگوں یگوں سے دھدھک رہی ہیں

منظر کے پیچھے بھی ایک نیا منظر ہے
چاروں جانب
اپنوں پرایوں کا لشکر ہے
بچ کے نکل جانے کی کوئی راہ نہیں ہے
کون ہے، جس کو
سب کے مر جانے پر بھی
زندہ رہنے کی چاہ نہیں ہے

کیسے کیسے لوگ ہیں
کیسے پتھر من ہیں
اِس یُگ میں سب دشاسن سب دریودھن ہیں
منظر منظر ایک سے منظر
ایک سے منظر دیکھ رہا ہوں

گئے برس میں
سچ مچ میں نے
کوئی نظم نہیں لکھی ہے
گئے برس میں
کچھ بھی نیا نہیں دیکھا ہے
کچھ بھی نیا نہیں سوچا ہے

گئے برس کے آسمان پر
پچھلی صدیوں کی جنگوں کا گرم دھواں ہے
اس دھرتی کے
کسی بھی گوشے میں
کوئی محفوظ کہاں ہے
سب کی رگوں میں
زہر رواں ہے
گئے برس کی آخری شب کے اندھیاروں میں
اُوشا اپنا رنگیں گھونگھٹ اٹھا رہی ہے
اور اک برس
مجھے کچھ کڑوی میٹھی یادیں دے کر
چلا گیا ہے
اُٹھ پاشی سن ——
نئے برس کی پہلی پہلی کرن نے تیرے
دروازے پر دستک دی ہے

اُٹھ پاشی ——
دروازہ کھول کے باہر آ
اور آگے بڑھ کر
نئی کرن کو گلے لگا لے
دل پر چھائے صدیوں پرانے گہرے اندھیارے کو مٹا لے

گنگا

گنگا!
میں صدیوں صدیوں کا تھکا ہوا ہوں
گنگا!
لے اب تو میں ترے کنارے آ کر بیٹھ گیا ہوں
گنگا!
شاید کل تک میں پتھر بن جاؤں
شاید تجھ کو چھو نہ سکوں میں
گنگا!
لہروں والے اپنے ہاتھ بڑھا کر
گود میں مجھے اٹھا لے جانا
گنگا!
ساتھ بہا لے جانا ——

سب دروازے کھول دے!

میں نے اپنے گھر کی ساری کھڑکیاں سب دروازے
کھول دیے ہیں
سرخ، سنہری گوؤں سنگ اوشا بھی آئے
کچے دودھ سے منہ دھو کر چندا بھی آئے
تیز نکیلی دھوپ بھی جھانکے
نرم، سہانی ہوا بھی آئے
تازہ کھلے ہوئے پھولوں کی
من موہن خوشبو بھی آئے
دیس دیس کی خاک چھانتا ہوا کوئی سادھو بھی آئے
اور کبھی بھولے سے
شاید
تو بھی آئے
یگوں یگوں سے
میں نے
اپنے دل کی ساری کھڑکیاں، سب دروازے
کھول رہے ہیں!

میری بیٹی زندہ ہے

کیا بتلاؤں ـــــــ
یہ صدیوں صدیوں کا اندھا قصہ ہے
کئی جنموں تک پھیلا ہے

اس لمبے، بے نور سفر میں
میری بیٹی
کہاں کہاں پر مجھ سے بچھڑی
یاد نہیں

نہیں بھیڑیے نہیں
وہ اس کے بھائی تھے
میں نے اُن کے سینے کھول کے دیکھے تھے
جن کے گھور اندھیروں میں
میری بیٹی

اپنے بدن کے لتے گم کر بیٹھی تھی

نہیں جانور نہیں
یہ اُس کا بھائی ہے
صدیوں کی تاریخ پرانی اس نے بھی دہرائی ہے
میری بیٹی پھر سے اپنے
بدن کے سارے لتے گم کر بیٹھی ہے
کیا بتلاؤں ـــــــــ
اب کے سفر میں
کہاں وہ مجھ سے بچھڑی ہے

کل بھی تھی وہ
آج ہے اور آئندہ ہے
میرے بیٹے!
اپنی ہوس کے آگے کیوں شرمندہ ہے
پھر سے اپنے ہاتھ بڑھا دے
میری بیٹی مری نہیں ہے
زندہ ہے

(منٹو کی کہانی ''کھول دو'' کے حوالے سے)

ہم کہیں نہیں جاتے اب ہمارے چوکھٹ پر
راستے بھی رکتے ہیں منزلیں بھی آتی ہیں

ٹھہرو!

میں آتا ہوں

اگر میرے فسانے میں مسرت کا کوئی پہلو نظر آئے
سمجھ لینا
تمھارے واسطے میں رات کے گنجان جنگل سے
چمکتے جگنوؤں کی قیمتی سوغات لایا ہوں
مرے اندر اندھیرے کا سمندر ہے
اُبھرتا ڈوبتا رہتا ہوں میں جس میں
تمھیں معلوم ہے : میرا عمل اب ختم ہے، اور رات باقی ہے
ابھی اک گھات باقی ہے
مرے آکاش کی حد میں ابھی سورج نہیں پہنچا
گھنی تاریکیوں میں چھٹپٹاتا ہوں
میں اپنے جسم کے دیوار و در سے سر کو ٹکراتا ہوں
پل میں ٹوٹ جاتا ہوں

نہ گھبراؤ کہ پھر سے خود کو یکجا کر رہا ہوں میں
نسوں میں اپنی پھر تازہ لہو کو بھر رہا ہوں میں
تمھارے واسطے میں رات کے گنجان جنگل سے
چمکتے جگنوؤں کی قیمتی سوغات لاتا ہوں
ذرا ٹھہرو!۔۔۔۔۔۔ میں آتا ہوں

پرانے شہروں کا سفر

جب میں اپنے بہت پرانے شہروں میں جاؤں گا
میری گٹھری میں مٹھی بھر مٹی
کچھ پھل پھول، ستارے ہوں گے
کچھ گلیاں، کچھ مورتیاں
کچھ رنگ برنگ عقیدے
کچھ نظارے ہوں گے

اور مرے ہمراہ: مرے احباب
برہا کے مارے ہوں گے

ہوا کہے گی: کیوں آئے ہو
یہ سب چیزیں کیوں لائے ہو
آسمان پر اڑتے ہوئے انجان پرندے
چھوٹے چھوٹے جھنڈوں میں دھرتی پہ اترتے

سب کو صاف دکھائی دیں گے
اور پرانے شہروں والے
اپنے گھروں کی چھتوں پہ چڑھ کے
برسوں تلک دہائی دیں گے
اور ہماری فتح کے نعرے، دور دور تک
چاروں طرف سنائی دیں گے

چڑیا

وہ چڑیا تھی
وہ پیڑ کی اک ٹہنی سے
دوسری ٹہنی پر جاتی تھی
گیت سناتی تھی

وہ چڑیا تھی
ست رنگی پنکھوں والی
گلے میں اس کے
ریشم ڈوری تھی
وہ میرے آنگن کھیلی تھی
وہ رنگ اڑاتی پھرتی تھی
جھانجھر چھنکاتی پھرتی تھی

وہ چڑیا تھی

اسے میں نے کل بھی دیکھا تھا
وہ مری منڈیر پہ بیٹھی تھی
پھر دیکھتے دیکھتے
پھر سے اڑی
اور دور آکاش میں نکل گئی
لو دن ڈوبا اور سانجھ ہوئی
میں بیٹھا رستہ تکتا ہوں
وہ اب تک لوٹ کے آئی نہیں
سچ کہتا ہوں :
وہ ابھی ابھی تو
مری منڈیر پہ بیٹھی تھی
پھر کہاں گئی؟

گھر آنگن

اس آنگن میں آئے تھے سب
اس آنگن میں کھیلے تھے
اک اک کر کے
اس آنگن سے
چلے گئے ـــــــ

میں بھی تھا اک
چپ چپ، گم سم
سارا منظر مجھ میں تھا
سب کا سب گھر مجھ میں تھا
اس گھر میں کیا آیا تھا
اس گھر سے کیا کچھ چلا گیا
یہ وہ جانے
یا میں جانوں

تم کون ہو ــــــ
تم کو دل کی بات بتاؤں کیوں؟
جو آنگن میرا اپنا ہے
اس آنگن میں لے جاؤں کیوں؟

خبر لاؤ اس کی

خبر لاؤ اس کی
جو موجود تھا
جس کو اپنے پروں میں چھپا کر
ہوا لے گئی

خبر لاؤ اس کی
جو کل تک
اِسی پیڑ کے سبز پتوں میں
گاتا ہوا اک پرندہ تھا
جس کے لیے
سارے موسم ہرے تھے

خبر لاؤ اس کی
سبھی کھیت اب جس کے خالی پڑے ہیں

یہی ہل چلانے کا اور بیج بونے کا موسم ہے
بادل صفوں میں کھڑے ہیں
برسنے کو تیار ہیں
کوئی جائے، بلا لائے اس کو

کوئی تو ہوگا

ہماری وادی میں اب خزاں ہے
سبھی درختوں نے اپنے پتے اتار پھینکے
کسی کی آنکھوں میں آنے والے حسیں دنوں کی
چمک نہیں ہے
کسی کے چہرے پہ زندگی کی رمق نہیں ہے
سبھی نے شاید سمجھ لیا ہے
کہ کل کوئی معجزہ نہ ہوگا
کبھی یہ موسم ہرا نہ ہوگا
یہ دن جو اَب ہے، طویل تر ہے
کہ ہر دعا اب کے بے اثر ہے

مگر میں اب بھی یہ سوچتا ہوں
کوئی تو ہوگا
گئی بہاروں کے پھول کچھ، جس کے گھر میں ہوں گے

کوئی تو ہوگا

مرے ہی جیسا

کہ دور کے سبزہ زار جس کی نظر میں ہوں گے

میں ہنسنا چاہتا ہوں

میں سمندر جتنا ہنسنا چاہتا ہوں
اور بوند جتنا رونا

ایشور!
میں صرف تیرے ہی جتنا
جینا چاہتا ہوں،
نت نئے سپنوں کے ساتھ
اپنوں کے ساتھ

ایشور!
میں پیغمبر نہیں ہوں
بالکل تیری طرح ہوں
میری خواہشوں کی فہرست
بڑی لمبی ہے

تیری فہرست سے بھی طویل——

لیکن میں
ایشور سے کیوں مخاطب ہوں؟
جب کہ مجھے معلوم ہے
وہ مجھے پھول جتنا ہنسائے گا
اور پھر آسمان جتنا رُلائے گا

میں ہنسنا چاہتا ہوں

میں سمندر جتنا ہنسنا چاہتا ہوں
اور بوند جتنا رونا

ایشور!
میں صرف تیرے ہی جتنا
جینا چاہتا ہوں،
نت نئے سپنوں کے ساتھ
اپنوں کے ساتھ

ایشور!
میں پیغمبر نہیں ہوں
بالکل تیری طرح ہوں
میری خواہشوں کی فہرست
بڑی لمبی ہے

تیری فہرست سے بھی طویل——

لیکن میں
ایشور سے کیوں مخاطب ہوں؟
جب کہ مجھے معلوم ہے
وہ مجھے پھول جتنا ہنسائے گا
اور پھر آسمان جتنا رُلائے گا

کیا دے سکتے ہو؟

کسی کو کیا دے سکتے ہو تم!
چاند کسی کو دے سکتے ہو؟
تارے ـــــ ؟
یا پھر جگمگ جگنو کسی کو دے سکتے ہو؟
سوکھی شاخ کو ہرا سا پتہ
پیاس کو شبنم کا اک قطرہ
بجھی بجھی سی آنکھ کو جیوتی
بھوک کو روٹی ـــــ
دے سکتے ہو؟
مجھے بتاؤ :
دھوپ کو سایہ دے سکتے ہو؟
وشت کو دریا دے سکتے ہو؟
تین سو پینسٹھ دنوں میں مجھ کو
اک دن اچھا دے سکتے ہو؟

غزلیں

O

اپنے گرد و پیش کا بھی کچھ پتہ رکھ
دل کی دنیا تو مگر سب سے جدا رکھ

لکھ بیاضِ مرگ میں ہر جا اَناالحق
اور کتابِ زیست میں بابِ خدا رکھ

اس کی رنگت اور نکھرے گی خزاں میں
یہ غموں کی شاخ ہے، اس کو ہرا رکھ

آج آئے گی اُداسی بال کھولے
آج اپنے دِل کا دروازہ کھلا رکھ

یوں بھی بہہ جائے گا سب سیلِ بلا میں
اپنے گھر کے سب در و دیوار ڈھا رکھ

نامرادی کا انھیں بھی تجربہ ہو
ان کے رستے میں بھی کوئی سانحا رکھ

سنسناتی رات کے آنے سے پہلے
دل میں جاتی دھوپ کا ٹکڑا سجا رکھ

بیش قیمت ہیں یہ دل کے زخم پاشی
ان چراغوں کو ہواؤں سے بچا رکھ

O

آگ لگتی نہ جہاں خوں کا سمندر بنتا
ایک اک گھر کسی محفوظ جگہ پر بنتا

چادرِ شب میں نہ یوں چاند ستارے سوتے
تم جو ہوتے تو کوئی اور ہی منظر بنتا

دور آکاش کے آنگن میں چمکتا ہوا چاند
ہاتھ آتا تو ترے ماتھے کا جھومر بنتا

دھوپ آنگن میں بکھرتی تری خوشبو اُڑتی
چاندنی چھت پہ اُترتی ترا پیکر بنتا

رونق زیست ہیں پاشی یہ محبت بھرے دل
درو دیوار بنانے سے نہیں گھر بنتا

○

سنگ ہے، گُل سا سنور جاتا بھی ہے
بن کے وہ خوشبو بکھر جاتا بھی ہے

وار بھی کرتا ہے مجھ پر جا بہ جا
آ کے میرے زخم بھر جاتا بھی ہے

لڑ بھی جاتا ہے وہ اپنے آپ سے
آئینے میں خود سے ڈر جاتا بھی ہے

بے گنہ کہتا ہے وہ باہر مجھے
اور عدالت میں مکر جاتا بھی ہے

یاد بھی آتا ہے وہ اکثر مجھے
ذہن سے لیکن اُتر جاتا بھی ہے

دیکھیے پاشیؔ کے رنگِ خاص تک
کیا کوئی اہلِ نظر جاتا بھی ہے

○

اس کو تو اے دوست وہاں کیا آنا تھا
ہم کو لیکن اپنا قول نبھانا تھا

اندر اندر الگ تھے ہم اک دوجے سے
ظاہر میں ملنا تو فنکارانہ تھا

اچھا ہوا وہ دعوت دینا بھول گیا
جا کے وہاں ہم کو بھی بہت پچھتانا تھا

جب تک ساتھ رہے تو جگمگ تھی دنیا
اُس کے بعد تو دُور تلک ویرانہ تھا

اُسے بھی ساری عمر سلگنا تھا پاشی
ہمیں بھی اپنے شعلوں میں جل جانا تھا

○

کبھی خود اپنے ہی اندر جو میں نے دیکھے ہیں
ذرا تو دیکھ وہ منظر جو میں نے دیکھے ہیں

جہاں اناج کی خوشبو، نہ آگ چولہوں میں
نہ دیکھ پاؤ گے وہ گھر جو میں نے دیکھے ہیں

ذرا تو موند لے آنکھیں تو میں دکھاؤں تجھے
کچھ ایسے خواب کہ شب بھر جو میں نے دیکھے ہیں

ہے آرزو کہ بچھادوں تمھارے رستے میں
وہ سارے ماہِ منور جو میں نے دیکھے ہیں

خدا کسی کو بھی یاشی کبھی دکھائے نہیں
دلوں کے خالی سمندر جو میں نے دیکھے ہیں

O

ایک آواز: جو راتوں میں سنا کرتے تھے
گھر سے نکلو تو ذرا اس کا پتا کرتے ہیں

ایک پل کو بھی نہ اس موڑ پہ رکنا یارو
قافلے آ کے یہیں پر تو لٹا کرتے ہیں

آنچ ہم لوگ کسی پر نہیں آنے دیتے
اپنی ہی آگ میں چپ چاپ جلا کرتے ہیں

کیا رہا زیست میں اب تجھ سے جدا ہونے کے بعد
لے کہ ہم خود سے بھی اب خود کو جدا کرتے ہیں

جب سے ہم پاشی کہ منسوب ہوئے ہیں ان سے
اپنی قسمت انہی آنکھوں میں پڑھا کرتے ہیں

○

موج میں تھا تو یہ بولا وہ بڑا ہے سب سے
میں پریشان ہوں کیوں اس نے کہا ہے سب سے

اک وہی شخص ہے جو دیکھتا رہتا ہے ہمیں
سب میں شامل ہے مگر پھر بھی جدا ہے سب سے

دن جو نکلا تو اُداسی بھی چلی جائے گی!
کوئی مانے کہ نہیں کہہ تو دیا ہے سب سے

ہر طرف پھیلی ہے اس شوخ بدن کی خوشبو
آج کا دن تو نرالا ہے نیا ہے سب سے

ہر مسافر ہے رہِ زیست میں خالی خالی!
کچھ نہ کچھ پاشیؔ کہیں چھوٹ گیا ہے سب سے

O

سال یہ لکھا نہیں گیا ہے
مجھے بھی سوچا نہیں گیا ہے

اُس منزل پر پہنچو جس تک !
کوئی بھی رستا نہیں گیا ہے

کبھی کبھی میں وہ پڑھتا ہوں
جس کو لکھا نہیں گیا ہے

تم خوشبو ہو جب تک تم کو
شاخ سے توڑا نہیں گیا ہے

اُس گھر کے بارے میں سوچو
جہاں اجالا نہیں گیا ہے

اُن کو شکایت بابِ وفا میں
اُن کا حوالا نہیں گیا ہے

ان کا کچھ اس طرح بچھڑنا
مجھ سے دیکھا نہیں گیا ہے

یوں تو سب اچھے ہیں لیکن
کسی کو پرکھا نہیں گیا ہے

رک جا پاشی اس رستے سے
کوئی دوبارا نہیں گیا ہے

آسائشیں دنیا کی بڑی چیز ہے پاشی
کیا حرج ہے تھوڑی سی جو غیرت نہیں رکھتے

O

اک جھلک اپنی دکھا: تو کون ہے
دہر میں مجھ سے بڑا: تو کون ہے

پھر بتاؤں گا تجھے، میں کون ہوں
زندگی پہلے بتا: تو کون ہے

ایک میں ہوں آئینے کے رو بہ رو
آئینے میں دوسرا: تو کون ہے

ہے اگر ہمت، بجھا میرے چراغ!
جانتا ہوں اے ہوا: تو کون ہے

چاند تاروں کی لویں چھوتا ہوا
میرے کاندھوں پر کھڑا: تو کون ہے

میں نے کب کا قتل کر ڈالا اُسے
پھر یہ جیتا جاگتا: تو کون ہے

پاشیؔ ہم جیسے گنہ گاروں کے بیچ!
اک اکیلا ، بے خطا: تو کون ہے

O

ہیں سارے انکشاف اپنے ہیں سارے ممکنات اپنے
ہم اس دنیا کا سارا علم لے جائیں گے سات اپنے

چمک ویسی نہ ماتھے پر، دمک ویسی نہ چہرے پر
ستارے کس کے گھر جانے لٹا آئی ہے رات اپنے

نہ ہوگی دل کشی دنیا میں، اک دن وہ بھی آئے گا
کہ سارے راز اُگل دے گی کسی دن کائنات اپنے

نہیں گر دیکھ سکتی موت سے لڑتے ہوئے مجھ کو
تو پھر اے زندگی لے جا تو سارے التفات اپنے

کھلا ہے عمر کی شامِ حزیں میں راز یہ پاشی
کہ ہر دم موت کو بھی ساتھ رکھتی ہے حیات اپنے

O

کس نے لکھا مرے نصاب میں سانپ
پڑھ رہا ہوں میں ہر کتاب میں سانپ

تحفۂ پھول اس کو بھیجے تھے
اور ملا ہے مجھے جواب میں سانپ

ایک آواز آئی: جام نہ چھو
جھک کے دیکھا تو تھا شراب میں سانپ

جس پہ کاٹی ہے ساری شب اس نے
تھا اسی بسترِ شباب میں سانپ

اُس کو دیکھا نہیں جو بام پہ آج
نظر آتا ہے ماہتاب میں سانپ

تار گونجے تو ڈس گئے دل کو
کس نے رکھا تھا یہ رباب میں سانپ

اس کی تعبیر کچھ تو کہہ پاشی
شب میں دیکھا ہے میں نے خواب میں سانپ

○

خواب میں جو دیکھا ہے دوبارا بھی آئے گا
کل تک اس پرچھائیں کا چہرا بھی آئے گا

نشر نہ ہونے دینا قصّہ مری وفا کا
اس میں شاید نام تمھارا بھی آئے گا

شرط یہی ہے پیاس کو لب پر تھامے رکھو
جس رستے سے جاؤ گے دریا بھی آئے گا

جا پہونچوں گا ہنستے کھیلتے منزل پر میں
ساتھ مرے مجھ سا کوئی بوڑھا بھی آئے گا

ہجر میں اس کے رو رو کر سو جانے والو
نیند میں اس کا خواب جھروکا بھی آئے گا

ہم بھی یہی تلقین کیے جائیں گے پاشی
وقت بُرا آیا ہے تو اچھا بھی آئے گا

○

ایک کہانی ختم ہوئی ہے ایک کہانی باقی ہے
میں بے شک مسمار ہوں لیکن میرا ثانی باقی ہے

دشتِ جنوں کی خاک اڑانے والوں کی ہمت دیکھو
ٹوٹ چکے ہیں اندر سے لیکن من مانی باقی ہے

ہاتھ مرے پتوار بنے ہیں اور لہریں کشتی میری
زور ہوا کا قائم ہے دریا کی روانی باقی ہے

گاہے گاہے اب بھی چلے جاتے ہیں ہم اس کوچے میں
ذہن بزرگی اوڑھ چکا دل کی نادانی باقی ہے

کچھ غزلیں ان زلفوں پر ہیں، کچھ غزلیں ان آنکھوں پر
جانے والے دوست کی اب اک یہی نشانی باقی ہے

نئی نئی آوازیں ابھریں پاشی اور پھر ڈوب گئیں
شہرِ سخن میں لیکن اک آواز پرانی باقی ہے

○

سچ پوچھو تو زخم ہمارے روشن ہیں
وہ کہتے ہیں چاند ستارے روشن ہیں

اسے یقیں ہے میرے لوٹ کے آنے کا
دُور اب بھی دریا کے کنارے روشن ہیں

کوئی بھی منظر آنکھ سے اوجھل نہیں ہوا
مری نظر میں سبھی نظارے روشن ہیں

خدا انھیں محفوظ رکھے ہر آفت سے
آسمان میں جو طیّارے روشن ہیں

بال بکھیرے بےسدھ سوئے ہوئے ہیں وہ
میری چھت پر چاند ستارے روشن ہیں

آج بھی پاشی میرے دل کے دفتر میں
ان کی یاد کے چند شمارے روشن ہیں

O

دن میں اب مجھ کو کہانی نہ سنا اور کوئی
میری ہی طرح نہ ہوجائے جدا اور کوئی

ہم تو سمجھے تھے وہی ہم ہیں، وہی چہرہ ہے
غور سے دیکھا تو آئینے میں تھا اور کوئی

زد میں طوفانوں کی ہے آج ہمارا یہ چمن
آشیاں اب کے تو اپنا نہ بنا اور کوئی

اس کے چہرے پہ کوئی رنگِ شناسائی نہ تھا
رو بہ رو تھا وہ مگر مجھ کو لگا اور کوئی

دل کو یارا بھی نہیں، تابِ نظارہ بھی نہیں
ایسا منظر تو مجھے اب نہ دکھا اور کوئی

[illegible] کہ وہ طرز نئی تھی پاشی
[illegible] اس سے چلا اور کوئی

○

ہر آفت سے بچا کر رکھو
خود کو دشت میں جا کر رکھو

چاند چراغ نہ بجھنے پائے
ان بالوں میں چھپا کر رکھو

وصل کا سورج جلنے کو ہے
سارے دیے بجھا کر رکھو

رہے خوشی سے دور ہمیشہ
غم کو یہ سمجھا کر رکھو

بہتر یہ ہے وصل سبو میں
ہجر کا زہر ملا کر رکھو

چاند آج کتنا روشن ہے
اپنی چھت پر لا کر رکھو

O

تو ہی کچھ کمال کر دے
مجھے خوش خیال کر دے

میں خوشی سے مر نہ جاؤں
میرے غم بحال کر دے

اسے کیا جواب دو گے
وہ اگر سوال کر دے

کوئی دے مثال ایسی
اسے بے مثال کر دے

میرے دکھ مجھے سنا کر
مجھ پُر ملال کر دے

وہی زہر لا جو پاشی
مجھے لا زوال کر دے

○

جامِ سخن میں جادو بھر
لب، عارض اور ابرو بھر

دہر میں رنگ اور خوشبو بھر
آ، اور میرا پہلو بھر

بجھی بجھی سی آنکھوں میں
جگمگ کرتے جگنو بھر

ہر سو ہے بارود کی بو
اس دنیا میں خوشبو بھر

اک دن دے: اس مکھ جیسا
اک شب دے: اس گیسو بھر

ساگر گہرے دکھ کے عوض
کوئی خوشی دے: آنسو بھر

پاشی اپنے شعروں میں
محسوسات کا جادو بھر

O

تیری یاد کا ہر منظر پس منظر لکھتا رہتا ہوں
دل کو ورق بناتا ہوں اور شب بھر لکھتا رہتا ہوں

بھری دوپہری سایے بناتا رہتا ہوں میں لفظوں سے
تاریکی میں بیٹھ کے ماہِ منوّر لکھتا رہتا ہوں

خواب سجاتا رہتا ہوں میں بجھی بجھی سی آنکھوں میں
جس سے سب محروم ہیں اسے میسر لکھتا رہتا ہوں

چھاؤں نہ بانٹے پیڑ تو اپنی آتش میں جل جاتا ہے
صرف یہی اک بات میں اسے برابر لکھتا رہتا ہوں

کیا بتلاؤں پاشی تم کو سنگ دلوں کی بستی میں
موتی سوچتا رہتا ہوں میں گوہر لکھتا رہتا ہوں

O

ہو رہی تھی گفتگو   آج ممکنات پر
لا کے پھول رکھ دیا   اس نے میرے ہات پر

ہم سدا نبھائیں گے   چھوڑ کر نہ جائیں گے
آگئی ہمیں ہنسی   آج ان کی بات پر

آپ ہی بتایئے   ہم سے مت چھپایئے
آپ بھی تو تھے میاں   جائے واردات پر

ہجر کی شبیں سبھی   صحبتیں ساری درد کی
کتنا بوجھ رکھ لیا   ہم نے اپنی ذات پر

سب نراس کیوں ہوئے   دل اداس کیوں ہوئے
سارے مل کے سوچیے   ان معاملات پر

کوئی کیا سمجھ سکے   ان کی اہمیت ہے کیا
غور کر رہا ہوں میں   آج جن نکات پر

○

اَبر کے سپنے تو تھے صحرا کے پاس
کیا ملا ہے آ کے اب دریا کے پاس

عمر بھر رکھا نہ جب رشتہ کوئی
جاؤ گے کس منہ سے اب دنیا کے پاس

خواب، یادیں، آرزوئیں، حسرتیں
تو بتا کیا کچھ نہیں فردا کے پاس

اس کے روز و شب کی بھی لے لیں خبر
آؤ چلتے ہیں دلِ تنہا کے پاس

غم میں ہے پاشی بڑی وارفتگی
وہ بٹھا تو لیتا ہے بہلا کے پاس

O

لوگ جرأت کبھی دکھاتے نہیں
آئینوں سے نظر ملاتے نہیں

جانتے ہیں کھرے نہ اُتریں گے
اس لیے خود کو آزماتے نہیں

خوف طاری ہے اس قدر غم کا
اب خوشی میں بھی مسکراتے نہیں

یاد رکھتے ہیں اپنے ہر غم کو
ہم کسی دوست کو بھلاتے نہیں

یہ اندھیرے عزیز ہیں پاشی
خود کو ہم روشنی میں لاتے نہیں

O

شعلۂ جنوں لے کر اک دیا بناتے ہیں
آ کہ ان اندھیروں میں راستا بناتے ہیں

یہ روایتوں والے اس لیے مخالف ہیں
ہم پرانی چیزوں کو کچھ نیا بناتے ہیں

آ کہ ساری دنیا کو کردیں آج حیراں ہم
ایک خواب کو لے کر واقعہ بناتے ہیں

اب کچھ ایسا کرتے ہیں اس میں رنگ بھرتے ہیں
اور اپنی دنیا کو خوشنما بناتے ہیں

آج کل بدلتے ہیں لوگ نت نئے چہرے
اور اُن کی خاطر ہم آئینہ بناتے ہیں

غیر کا تو کہنا کیا وہ جو خاص اپنے ہیں
میرا ذکر آتے ہی حاشیا بناتے ہیں

آج بھی زمانے میں کچھ یزید زندہ ہیں
جو ہر ایک بستی کو کربلا بناتے ہیں

پھول، چشم، لب پاشی، محفلِ طرب پاشی
دیکھ،ہم بھی لفظوں سے کیا سے کیا بناتے ہیں

انا کو نہ یاروں کی محفل میں لا
کہ یہ چیز گھر رکھ کے آنے کی ہے

O

ہوئے ہیں بند دشاؤں کے سارے رستے آ
اندھیرا چھانے لگا لوٹ کر پرندے آ

میں تیری ساری تمازت کو جذب کرلوں گا
تو آفتاب! کبھی میرے دل میں بجھنے آ

کبھی دکھادے وہ منظر جو میں نے دیکھے نہیں
کبھی تو نیند میں اے خواب کے فرشتے آ

یہاں تو کب سے اندھیروں میں غرق ہے دنیا
ادھر جو آ تو ستاروں کی شال اوڑھے آ

نہ چپکے چپکے سلگ، جی کو اپنے ہلکا کر
تجھے یہ کون سا دکھ ہے کبھی بتانے آ

بڑا سکون ملے گا تجھے یہاں آکر
جو ہوسکے تو کبھی میرے دل میں رہنے آ

میں شعلہ شعلہ دہکتا سا دشت ہوں پاشی
اگر گھٹا ہے تو ساون کی تو برسنے آ

O

اس کو کچھ تو ملتا ہے مجھ پہ ظلم ڈھانے سے
باز وہ نہ آئے گا میرا گھر جلانے سے

گا رہی ہیں دیواریں، رقص میں ہے آنگن بھی
کتنی رونقیں آئیں تیرے لوٹ آنے سے

آ کہ تیرے ماتھے پر اب اسے سجادوں میں
چاند لے کے آیا ہوں رات کے خزانے سے

وہ بھی ان دنوں یارو اپنی چال میں گم ہے
ہم بھی کچھ نہیں کہتے آج کل زمانے سے

ہم نے اپنی آنکھوں میں خواب کچھ سجائے ہیں
اپنا بھی تعلق ہے زیست کے گھرانے سے

وہ ہے بے نظر پاشیؔ، اس کو کیا خبر پاشیؔ
کتنے دل سلگتے ہیں اک دیا بجھانے سے

O

ہم ہیں یا نہیں اس کا بھی پتا نہیں ہوتا
لگتا ہے وہاں ہیں جہاں خدا نہیں ہوتا

جب رات ڈھلے، دنیا بے سدھ سوتی ہے
سنتے ہیں وہی، جو کبھی سنا نہیں ہوتا

کچھ بھی پہنیں اچھا نہیں لگتا تن پر
کچھ بھی کھائیں ہم اس میں مزا نہیں ہوتا

کس بات پہ ہوگا خفا وہ کہہ جاتے ہیں
جسے سن کے ہو خوش وہی لفظ ادا نہیں ہوتا

سنتے ہیں کہ جو بھی چاہو وہ ہو جاتا ہے
لیکن دنیا میں اپنا کہا نہیں ہوتا

میں قدم قدم پر دیکھ رہا ہوں اس کو
جس راہ چلوں وہ شخص جدا نہیں ہوتا

کیا جانے وہ پاشی کس مٹی کا بنا ہے
کچھ بھی کہہ لو، وہ کبھی خفا نہیں ہوتا

○

ابھی پرانی دیواریں مت ڈھانے دو
پہلے مجھ کو دنیا نئی بسانے دو

اوڑھ لیا ہے میں نے لبادا شیشے کا
اب مجھ کو کسی پتھر سے ٹکرانے دو

پڑھ کے حقائق کہیں نہ اندھا ہو جاؤں
مجھ کو اب ہو سکے تو کچھ افسانے دو

ہے کوئی ایسا جو دنیا سے ٹکر لے
ہم کو دیکھو اک ہم ہیں دیوانے دو

نہیں چاہیے کچھ بھی ہم درویشوں کو
جس کا جو بھی کچھ ہے اسے لے جانے دو

برسوں سے بچھڑا ہوا تیرا غم پاشی
آج اچانک ملا ہے گلے لگانے دو

O

بند کیں آنکھیں جو پل بھر کے لیے
ترسا ہوں اک ایک منظر کے لیے

کہکشاں کی سمت آ نکلا ہوں جب
کچھ ستارے لے چلوں گھر کے لیے

جمع کر لیجیے ابھی سے صبر و ضبط
دور کے دلدوز منظر کے لیے

احتیاطاً باندھ کر رکھ لیجیے!
جون کے کچھ دن دسمبر کے لیے

راکھ چٹکی بھر ہوں میں نذرِ ہوا!
بوند اک پیاسے سمندر کے لیے

O

اب کچھ ایسی کوشش ہو وہ آئے تو
کوئی جائے اور اسے سمجھائے تو

مرے لیے وہ ہر موسم لاسکتا ہے
لیکن اپنے جی کو بھی کچھ بھائے تو

معذوری ہے یا کوئی مجبوری ہے
جو بھی کچھ ہے آکر ہمیں بتائے تو

عقل وجنوں کی جنگ اب فیصلہ کن ہوگی
بہت دنوں میں دو پربت ٹکرائے تو

باشی اسے سنبھلنا بھی آجائے گا
پہلے وہ اس راہ میں ٹھوکر کھائے تو

○

کس کے لبوں پہ پوچھ کہ قصّا نہیں مرا
صحرا مرا نہیں ہے کہ دریا نہیں مرا

اٹھا ہوں تیری بزم سے دامن کو جھاڑ کر
اب لوٹ کے میں آؤں بھروسا نہیں مرا

دل کے شجر پہ دکھ کا بسیرا ہے آج بھی
رشتہ ابھی حیات سے ٹوٹا نہیں مرا

منسوب ہو گئے ہیں یہ سب کس کے نام سے
سارے شجر پہ ایک بھی پتّا نہیں مرا

شاید مرے حریف مرے دوست ہو گئے
کچھ دن سے ان کی بزم میں چرچا نہیں مرا

ہاشمی یہ میں نے کس کے بدن کو پہن لیا
آئینہ کہہ رہا ہے یہ چہرا نہیں مرا

O

یہ کیسی آگ برستی ہے آسمانوں سے
پرندے لوٹ کے آنے لگے اڑانوں سے

کوئی تو ڈھونڈ کے مجھ کو کہیں سے لے آئے
کہ خود کو دیکھا نہیں ہے بہت زمانوں سے

پلک جھپکتے میں میرے اُڑان بھرتے ہی
ہزاروں تیر نکل آئیں گے کمانوں سے

ہوئی ہیں دیر و حرم میں یہ سازشیں کیسی
دھواں سا اُٹھنے لگا شہر کے مکانوں سے

شکار کرنا تھا جن کو شکار کر کے گئے
شکاریو! اتر آؤ تم اب مچانوں سے

روایتوں کو کہاں تک اُٹھائے گھومو گے
یہ بوجھ اتار دو پاشیؔ تم اپنے شانوں سے

O

سب یہ کہتے ہیں پرایا کون ہے
پھر یہ دیواریں اٹھاتا کون ہے

کس کے قدموں کے نشاں ہیں ہر طرف
آسمانوں پر یہ جاتا کون ہے

خود میں دھنستا جارہا ہوں دم بہ دم
میرے شانوں پر یہ بیٹھا کون ہے

رات کی تنہائیوں میں دیر تک
مجھ پہ سر رکھ کر سسکتا کون ہے

صبح تارے چنتا ہوں بستر سے میں
رات میرے گھر میں آتا کون ہے

مضطرب سا کروٹیں لیتا ہوا
میرے بستر پر یہ سویا کون ہے

آگے بڑھنے ہی نہیں دیتا مجھے
میرے پیروں سے یہ لپٹا کون ہے

تو ہی بتلا دے کہ تیرے شہر میں
سب پرائے ہیں تو اپنا کون ہے

کہہ دیا تھا اس پہ تکیہ مت کرو
پر مری دنیا میں سنتا کون ہے

کھڑکی کھلتی ہے نہ دروازہ کوئی
آج کل اس گھر میں رہتا کون ہے

جب ہمارے درمیاں کوئی نہیں
پھر بتا پاشی ! یہ دنیا کون ہے

O

خوشبوئے درد کے بغیر، رنگِ جمال کے بغیر
کیسے گزر گئی حیات، ہجر و وصال کے بغیر

ان میں ترا ہی رنگ ہے، ان میں ترا ہی روپ ہے
پھولوں کی کیا مثال دوں تیری مثال کے بغیر

تو مرا حوصلہ تو دیکھ، پھر ہوں اسی کے روبرو
تیر و تبر ہیں اس کے پاس اور میں ڈھال کے بغیر

میری طلب کو پڑھ لیا اس کی نگاہِ تیز نے
سو سو ہیں عذر اس کے پاس میرے سوال کے بغیر

بڑھ جا تو مجھ کو روند کر، منزلِ نو پہ کر نظر
تیرا عروج ہے محال، میرے زوال کے بغیر

باقیؔ وہ دل کا شہر ہو، دشت ہو یا وہ بحر ہو
جلی نہیں کوئی جگہ، ان کے جمال کے بغیر

O

دل کو بھی ہم راہ پہ لاتے رہتے ہیں
خود کو بھی کچھ کچھ سمجھاتے رہتے ہیں

چادر اپنی بڑھے، گھٹے یہ فکر نہیں
پاؤں ہمیشہ ہم پھیلاتے رہتے ہیں

چگنے دیتے ہیں چڑیوں کو کھیت اپنے
پھر یوں ہی بیٹھے پچھتاتے رہتے ہیں

تپش بدن کی بڑھتی ہے جب فرقت میں
نل کے نیچے بیٹھ نہاتے رہتے ہیں

رات بھگوتے ہیں دامن کو اشکوں سے
صبح دھوپ میں اسے سکھاتے رہتے ہیں

کہیں کسی کی نظر نہ ہم کو لگ جائے
اپنی موت کی خبر اڑاتے رہتے ہیں

769

اَدب میں پاٹی ساکھ ہماری قائم ہے
کبھی کبھی ٹی وی پر آتے رہتے ہیں

صرف قصہ ہے یہ کہانی ہے
کس نے صحرا کی خاک چھانی ہے

اپنے اپنے گھروں میں سب محفوظ
میرے حصے میں لامکانی ہے

میرا بچپن چھپا ہے گلیوں میں
میکدے میں مری جوانی ہے

سکھ بھرے لفظ لکھ رہے ہیں ہم
دکھ کی قیمت ہمیں چکانی ہے

ہم سے سن قصہ وفا پاشی
ہم نے صحرا کی خاک چھانی ہے

○

خوش ہو اے دنیا کہ اک اچھی خبر لے آئے ہیں
سب غموں کو ہم منا کر اپنے گھر لے آئے ہیں

اس قدر محفوظ گوشہ اس زمیں پر اب کہاں
ہم اٹھا کر دشت میں دیوار و در لے آئے ہیں

سنسناتے آسماں میں اُن پہ کیا گزری نہ پوچھ
آنے والے خوں میں تر کچھ بال و پر لے آئے ہیں

دیکھتا ہوں دشمنوں کا ایک لشکر ہر طرف!
کس جگہ مجھ کو یہ میرے ہم سفر لے آئے ہیں

میں کہ تاریکی کا دشمن میں اندھیروں کا حریف
اس لیے مجھ کو ادھر اہلِ نظر لے آئے ہیں

مجھ پہ ہی باشی ہوئیں اُن کی کرم فرمائیاں
جو بھی تھے الزام وہ سب میرے سر لے آئے ہیں

○

نشہ غم کا اُترہ جانے لگا تھا
کہ دل کا زخم بھر جانے لگا تھا

بہت روکا مری آوارگی نے
میں جب کل شام گھر جانے لگا تھا

لٹا ہے قافلہ جس موڑ پر اب
وہاں میں بھی ٹھہر جانے لگا تھا

مرا ہی عکس تھا وہ آئینے میں
میں جس کو دیکھ ڈر جانے لگا تھا

حریفوں نے مجھے یکجا کیا ہے
وگرنہ میں بکھر جانے لگا تھا

جہاں پاشی مرادیں بٹ رہی تھیں
میں اُس در سے گزر جانے لگا تھا

O

پل دو پل کا وقت بہت ہے اب میرے مرجھانے میں
اور اب کتنی دیر کرو گے تم بادل برسانے میں

جب میں بڑھ کر وار کروں گا اُس کی سدا بہاری پر
دو اک پیڑ سجا دے گا تب وہ میرے ویرانے میں

جب سے میری آنکھوں نے اک دھوپ کا ٹکڑا دیکھا ہے
تب سے ہی وہ جٹا ہوا ہے تاریکی پھیلانے میں

اُس پر کوئی اعتراض نہ کر بیٹھوں میں، اِس ڈر سے
ذکر مرا بھی کر دیتا ہے اب اپنے افسانے میں

اُس نے بھی غیروں کی شہ پر ملنا جلنا چھوڑ دیا
میں بھی یارو آ ہی گیا بس لوگوں کے بہکانے میں

خدا ہمارا آسمان پر مرا نہیں ہے، زندہ ہے
پاشی صاحب حرج ہی کیا ہے یہ افواہ اڑانے میں

○

کچھ کچھ ہم بھی سمجھ چکے ہیں لوگوں کے سمجھانے پر
صحرا میں بھی پھول کھلیں گے پر اُن کے آجانے پر

اب کے بھی جھلسے گی بستی اب کے بھی ترسیں گے لوگ
اب کے بھی ساون برسے گا دور کسی ویرانے پر

خوف ہے اس کو کہیں نہ اس کے دیوار و در ہل جائیں
شاہ کے گھر میں واویلا ہے میرے چپ ہوجانے پر

ہر پل سوچتا رہتا ہے وہ میرے زیاں کے بارے میں
ہر پل وہ تیار ہے میرے گھر کی آگ بجھانے پر

کرتا ہے اعلان وہ ہرجا، اپنی شفقت کا پاشی
جڑوں میں میری لیکن پانی دیتا ہے مرجھانے پر

○

اس دور میں رشتہ کوئی توڑا نہیں جاتا
دکھ درد میں انسان کو پرکھا نہیں جاتا

بوسیدہ ہو کتنا ہی ، ہو کتنا ہی پرانا
یہ پیرہنِ جسم اتارا نہیں جاتا

آ جائیں جو ضد پر تو لٹا دیتے ہیں سب کچھ
ہم سے تو یہ جینے کا سلیقہ نہیں جاتا

یاد آتی ہیں پردیس میں بھی گھر کی فضائیں
بستر ہو گلوں کا بھی تو سویا نہیں جاتا

اشعار ہیں احساس کے پارے انھیں پاشی
محسوس کیا جاتا ہے سمجھا نہیں جاتا

O

اتری فلک سے شام ہوا گنگنائے ہے
لگتا ہے کوئی دور سے مجھ کو بلائے ہے

اس عشق کا برا ہو کہ ہر رُت بدل گئی!
پھاگن اڑائے خاک تو ساون جلائے ہے

اس شہرِ نا مُراد میں ایسا بھی شخص ہے
سورج کو ڈھانپ دے ہے اندھیرے بچھائے ہے

ہم فاقہ مست لوگوں کی فطرت عجیب ہے
آداب محفلوں کے تو، کس کو سکھائے ہے

پاشی ترے مزاج سے واقف ہیں لوگ سب
کس کی غزل یہ آج تو محفل میں گائے ہے

O

شہر میں ہوں گے کہ جنگل میں کہ گھر میں ہوں گے
ہم جہاں ہوں گے بلاؤں کے اثر میں ہوں گے

جتنے رستے ہیں وہ سب جانتے ہیں ان کے گھر تک
جتنے منظر ہیں وہ سب ان کی نظر میں ہوں گے

خود کو محفوظ نہ پائیں گے کہیں بھی جاکر!
ہم کہ ہر شہر میں اک خوف میں ڈر میں ہوں گے

چاندنی ڈھونڈے گی سنسان گھروں میں ہم کو
اور ہم دور اندھیروں کے سفر میں ہوں گے

ہم کہ کھو جائیں گے اپنے ہی بدن میں پاشی
کل کسی قصے میں ہوں گے نہ خبر میں ہوں گے

○

گھر کے اندر جگہ جگہ منظر وہ سنہرا رکھ دے گا
لیکن گھر کے باہر سنگینوں کا پہرا رکھ دے گا

اس کا زور کہ ساری عمر نہ خود کو میں پہچان سکوں
وہ میرے آئینے میں کسی اور کا چہرا رکھ دے گا

میری بصارت چھینے گا وہ تاریکی پھیلا دے گا
پھر میری خدمت پر کوئی ملازم بہرا رکھ دے گا

جب میری مایوسی مجھ کو اکسائے گی بغاوت پر
تب وہ میری آنکھوں میں اک خواب سنہرا رکھ دے گا

جب جب بھی میں قدم بڑھاؤں گا پاشی منزل کی طرف
وہ میرے رستے میں کوئی سمندر گہرا رکھ دے گا

○

غفلت زدوں کے شہر میں ہشیار کون ہے
جب میں ہی سو رہا ہوں تو بیدار کون ہے

خود بڑھ کے روک دیتا ہے وہ راستہ مرا
پھر پوچھتا ہے: راہ کی دیوار کون ہے

مجھ سا یہ ہو بہو مرے اندر چھپا ہوا
ناراض سب سے خود سے یہ بیزار کون ہے

نیکی کرو کنویں میں گرا دو خلوص کو
اس جنس رائیگاں کا خریدار کون ہے

کس نے دیے جلائے ہیں پانی مرے لیے
مجھ کو بلا رہا ہے جو اس پار کون ہے

O

چاند جب اپنی چھت پر ہوگا
وہ بھی کیسا منظر ہوگا

اب وہی منصف کہلائے گا
جس کے ہاتھ میں خنجر ہوگا

شیشے کا گھر بنا لیا ہے
اب پتھراؤ جم کر ہوگا

اس کی گلی میں آ نکلے ہیں
اس کا چرچا گھر گھر ہوگا

کیا غمِ دوراں، کیا غمِ جاناں
سب کا حملہ مجھ پر ہوگا

کل ساری شب سو نہ سکے ہم
اب تو ایسا اکثر ہوگا

شاخ پہ پھول کھلا ہے پاشی
چھو لو گے تو پتھر ہوگا

O

اک شہر خموشاں ہے صدا کوئی نہیں ہے
لکھا ہے یہاں اچھا بُرا کوئی نہیں ہے

ہر شخص یہاں درد کے رشتے میں بندھا ہے
سب دور سہی پھر بھی جدا کوئی نہیں ہے

لوٹے ہیں مرے شہر شر انگیز سے جو لوگ
کہتے ہیں مرے گھر میں بچا کوئی نہیں ہے

اب کاٹ دیے پاؤں ہر اک شخص کے اس نے
اس شہر میں اب اس سے بڑا کوئی نہیں ہے

پاشی جی عجب بزم ہے یہ نقد و نظر کی
عالم تو ہیں سب لکھا پڑھا کوئی نہیں ہے

O

لوگ جب جشن بہاروں کا منانے نکلے
ہم بیابانوں میں تب خاک اڑانے نکلے

کھل گیا دفترِ صد رنگ ملاقاتوں کا
حسن کے ذکر پہ کیا کیا نہ فسانے نکلے

عشق کا روگ کہ دونوں سے چھپایا نہ گیا
ہم تھے سودائی تو کچھ وہ بھی دوانے نکلے

جب کھلے پھول چمن میں تو تری یاد آئی
چند آنسو بھی مسرت کے بہانے نکلے

شہر والے سبھی بے چہرہ ہوئے ہیں پاشی
ہم یہ کن لوگوں کو آئینہ دکھانے نکلے

O

گاتا ہوں میں تیری مدحت سیاں پیر
بھر میرے اظہار میں ندرت سیاں پیر

تیرے گھر میں چاند ستارے روشن ہیں
تیرے گھر رہتی ہے محبت سیاں پیر

رستہ رستہ تیرے نام کی خوشبو ہے
بستی بستی تیری شہرت سیاں پیر

پھول، ستارے، خواب، فسانے، آرزوئیں
یعنی سب کچھ تری بدولت سیاں پیر

ہر گھر میں جلتا ہے تیرا چاند چراغ
ہر دل پر ہے تری حکومت سیاں پیر

میں پیاسا ہوں آیا ہوں اب پاس ترے
مجھ پر بھی برسا اب رحمت سیاں پیر

غموں نے چاروں اور سے گھیرا ہے مجھ کو!
کر اب تو ہی مری حفاظت سیاں پیر

تیرے ہی در پر آ کر ملتا ہے سکوں
تیرے قدموں میں ہے جنت سیاں پیر

تو ہے مالک اور میں تیرا چاکر ہوں
تو میری، میں تیری ضرورت سیاں پیر

کشتی میں اب مجھے بٹھانا تیرا کام
اس کے آگے میری قسمت سیاں پیر

اور بھلا کیا چاہے گا تیرا پاشی
مل گئی تیرے نام کی دولت سیاں پیر

O

کوئی اپنا ہم نوا پیدا کریں
آؤ خود سے رابطہ پیدا کریں

اس کو بھی دیں خود شناسی کا سبق
اپنے اندر بھی اَنا پیدا کریں

اپنے اپنے ہیں یہاں سب کے خدا،
ہو جو سب کا وہ خدا پیدا کریں

آؤ اس بے رنگ دنیا میں کہیں
کوئی منظر خوشنما پیدا کریں

جاں نثاری لائیں پاشی خود میں بھی
اُس کے دل میں بھی وفا پیدا کریں

O

جن سے ہونا ہے مخاطب وہ نظر تو آئیں
پہلے سب لوگ بلندی سے اُتر تو آئیں

پھر بتائیں مجھے لگتی ہے یہ دنیا کیسی
دیکھنے والے مرے خواب نگر تو آئیں

صبح کی منزلِ نو کی بھی خبر لائیں گے
رات کے گہرے سمندر سے گزر تو آئیں

ان کے قدموں میں بچھادوں گا ستارے لاکر
بھولے بھٹکے ہی سہی وہ مرے گھر تو آئیں

کہیں آرام سے بیٹھیں تو چلے ذکر اس کا
اس کڑی دھوپ میں دو چار شجر تو آئیں

○

جہاں جہاں بھی ہے جو کچھ کمال اس کا ہے
اگر نہیں ہوں کہیں میں، زوال اس کا ہے

خوشی نہ ہو سکی حاصل، پہنچ کے منزل پر
جو رہ گیا ہے سفر میں، ملال اس کا ہے

فلک سے جیسے برستی ہے چاندنی کی پھوار
ہے آنکھ بند مری اور خیال اس کا ہے

یہیں پہ ڈال دو ڈیرے یہیں کے ہو جاؤ
یہ شہر خوشنما و بے مثال اس کا ہے

وفا کے ذکر پہ سب چپ سے ہو گئے پاشی
جواب کس کے ہے بس میں سوال اس کا ہے

O

ڈور کسی کو یاد آتا ہوں رات مجھے پاگل کرتی ہے
گھر سے دور نکل جاتا ہوں رات مجھے پاگل کرتی ہے

اک انجانے شہر میں دیکھوں شکل کوئی جانی پہچانی
اس کی اور کھنچا جاتا ہوں رات مجھے پاگل کرتی ہے

دور دیس اک گھر ہے اپنا جیسے کوئی اک سندر سپنا
سپنے میں خود کو پاتا ہوں رات مجھے پاگل کرتی ہے

ایسی کوئی اب رات نہ آئے چھین کے جو مجھ کو لے جائے
خود کو مگر بے بس پاتا ہوں رات مجھے پاگل کرتی ہے

پاشی دل کو چین نہ آئے، گھیریں ان کی یاد کے سائے
رات آئے تو گھبراتا ہوں رات مجھے پاگل کرتی ہے

O

مرے تیرہ دل کو اُجال بھی
کبھی آ کے کر یہ کمال بھی

مرے ساتھ ساتھ عروج تھا
مرے آگے آگے زوال بھی

کبھی ہجر میں بھی ہے لطف سا
کبھی کانٹا ہے وصال بھی

کوئی دیتا ہم کو جواب کیا
کبھی کر سکے نہ سوال بھی

جہاں سو رہے ہیں وہ منہ کھلے
وہاں اڑ رہا ہے گلال بھی

ابھی آ رہی ہے وہی گلی
ذرا دل کو باشیؔ سنبھال بھی

O

ہر بات پہ یوں اس کا اُلجھنا بھی وہی ہے
اس دل کی مگر بات سمجھتا بھی وہی ہے

سنتے ہیں کہ: ہراک یہاں شاکی ہے اُسی کا
کہتے ہیں کہ: ہر ایک کی سنتا بھی وہی ہے

اُجلے سے وہ کچھ چہرے دکھائی نہیں دیتے
ہے دن بھی وہی اور اُجالا بھی وہی ہے

سچ کہنے کی ہمت نہیں کر پاتا ہے کوئی
آتا ہے نظر سب جسے، اندھا بھی وہی ہے

بے وجہ نہیں قتل ہوا مجھ سے خدا کا
جب زائچہ پڑھتا ہوں تو لکھا بھی وہی ہے

رشتہ ابھی ٹوٹا نہیں ہم دونوں کا پاشی
میں بھی ہوں وہی، پیڑ پہ پتا بھی وہی ہے

O

وہ انساں تھے مگر ایسے نہیں تھے
لڑو جھگڑو، وہ کچھ کہتے نہیں تھے

بہار آئی تو اِن آنکھوں نے دیکھا
کسی بھی پیڑ پر پتے نہیں تھے

نہیں دیکھے ہیں اُن جیسے پرندے
تھے بال و پَر مگر اڑتے نہیں تھے

انھیں اب ڈھونڈ کر لائیں کہاں سے
وہ چہرے جو کبھی بجھتے نہیں تھے

عجب بے رونقی سی تھی دلوں میں
کسی کی آنکھ میں سپنے نہیں تھے

بڑے ہی خوبصورت شہر تھے سب
مگر ہاں! لوگ کچھ اچھے نہیں تھے

انھیں لکھے تھے خط ہم نے بہت سے
مگر ان تک کبھی پہونچے نہیں تھے

سخن نازک تھے یوں تو سب کے پاشی
گلوں جیسے مگر لہجے نہیں تھے!

پہلے آسمان کا زوال

فہرست

1-	صد سطری حکم نامہ	799
2-	تنگ اندھیرا زینہ	805
3-	س کا جنم	810
4-	زرد گھاس کا میدان	815
5-	ٹوٹی ہوئی رات	823
6-	اس کی لاش	827
7-	بانہوں کے گھیرے میں	834
8-	دوسرا آدمی	838
9-	رات سے گھر تک	844
10-	پینتیس برس پرانا آدمی	849
11-	آدمی نامہ	854
12-	پہلے آسمان کا زوال	861

چندرکانتا کے نام

سرنامہ

میں نے کبھی کبھی یہ محسوس کیا ہے کہ میں وہ نہیں ہوں، جو ہوں۔ میرے اندر ایک اور شخصیت ہے، جسے میں مسلسل جی رہا ہوں جو میری حقیقی شخصیت ہے میں کہہ نہیں سکتا کہ اس شخصیت کا تعلق موجودہ معاشرے سے، اس ملک کی تہذیب سے اور انسانی مسائل سے کتنا گہرا ہے۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ ان دو شخصیتوں کے درمیان کبھی کوئی تصادم نہیں ہوا۔ میری داخلی شخصیت اور خارجی شخصیت کے درمیان ہمیشہ سے ایک فاصلہ رہا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ دونوں کے سفر کا رخ شمالاً جنوباً رہا ہے۔ لہذا روز بروز ان دو کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے۔

مجھے اپنی خارجی شخصیت سے کوئی لگاؤ ہے نہ دلچسپی۔ زندگی کا یہ پہلو شاید منفی بھی ہو سکتا ہے لیکن ایسا کیوں ہے۔ اس کا سراغ لگانے کی میں نے کبھی کوشش نہیں کی اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے۔ میری داخلی شخصیت ہی حقیقی شخصیت ہے اور میرا تخلیقی اظہار اسی شخصیت کا اظہار ہے۔

ایک تہذیب جو موہنجودڑو میں دفن ہو گئی۔ ایک جیتا جاگتا شہر جو پشاور کی منوں مٹی تلے اتر گیا۔ ایک معاشرہ جو تاریخ کے پتوں میں اسیر ہو گیا، ایک کتاب جس کا لفظ لفظ کافور بن کر اڑ گیا اور ایک آدمی جو صدیوں کے غبار میں معدوم ہو گیا۔ یہ سب کچھ میری اسی شخصیت کے خون میں شامل ہے۔ مجھے اس سے بحث نہیں کہ یہ شخصیت کتنی پرانی اور بوسیدہ ہے اور اس کے وجود کا موجودہ معاشرے سے اس ملک کی موجودہ تہذیب سے اور موجودہ مسائل سے تعلق کتنا گہرا ہے

لیکن اتنی بات تو صاف ہے کہ گمشدہ تہذیبی روّیوں کی تلاش کا عمل، عصر موجودہ کے انسانی مسائل کو جانے اور سمجھے بغیر ممکن نہیں۔

پہلے آسمان کا زوال میں شامل کہانیاں میری اسی شخصیت کا اظہار ہیں۔ جب کہ خود میرے لیے یہ شخصیت کسی حد تک مشکل ہے تو عجب نہیں کہ قارئین کو ان کہانیوں کی روح تک رسائی حاصل کرنے میں ایک طویل ذہنی سفر طے کرنے کے بعد ہی کسی قدر دقت کا سامنا ہو۔ لیکن یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی چیز کو مکمل طور پر جان لینے کے بعد اس میں کوئی مزید دلچسپی باقی رہ جائے گی۔ اردو کہانی کا سفر شروع ہی سے منصوبہ بند رہا ہے (اور شاید یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہمارے بیشتر نقاد اسے ادب کی ایک تخلیقی صنف کے طور پر قبول کرنے پر تیار نظر نہیں آتے) اس اعتبار سے یہ کہانیاں اُردو کہانی کی روایت کے دھارے سے الگ تھلگ نظر آئیں گی۔ میری داخلی شخصیت ادب کو مختلف اصناف کے ڈبوں میں بند کر کے تولنے کی قائل نہیں ہے۔ کسی بھی صنف کی حیثیت محض لباس کی سی ہے یعنی مکمل طور پر خارجی۔ اصل چیز تو جسم ہے، جس کی نشو ونما میں فطری عمل کارفرما ہوتا ہے۔

—— کمار پاشی

دہلی

20 اپریل 1972

صدسطری حکم نامہ

پہاڑ سے اترنے والا پہلا آدمی میرے جاننے والوں میں سے تھا۔عین ممکن ہے کہ اس سے پہلے بھی میرے جاننے والوں میں سے کوئی شخص پہاڑ سے نیچے اترا ہو لیکن مجھے یا کسی کو کسی ایسے حادثے یا واقعہ کا علم نہیں ہے۔لہٰذا میرے نزدیک پہاڑ سے اترنے والا وہ پہلا آدمی تھا۔اس نے سرخ رنگ کی نکٹائی لگا رکھی تھی اور اس کے دائیں ہاتھ میں صدسطری حکم نامے کا کاغذ تھا۔پہاڑ سے اترنے کے بعد وہ تیزی سے وادی کی طرف بڑھنے لگا۔صاف لگتا تھا کہ وہ بہت جلدی میں ہے۔ وادی کے لوگ سو رہے تھے۔کہنا آسان نہیں تھا کہ اس وقت دن تھا یا رات تھی آسمان گہرے کالے بادلوں سے اٹا ہوا تھا اور پوری وادی تاریک فصیلوں کے درمیان گھری ہوئی تھی۔پانی مسلسل کئی گھنٹے برسا تھا اور اب بھی ننھی ننھی بوندیں جگہ جگہ ایڑی ایڑی پانیوں پر گر کر آواز پیدا کر رہی تھیں۔ قدم قدم پر گنجان درخت سیاہ بھوتوں کی طرح جھلاہٹ میں ہوا کو پیٹ رہے تھے مگر وہ ان سب سے بے خبر تیزی سے وادی کی طرف بڑھ رہا تھا لوگ سو رہے تھے۔

کون جانتا تھا کہ کوئی اس موسم میں بھی مسلسل سفر میں ہے اور وادی کے لوگوں سے ملنے کے لیے بے تاب ہے —— کون جانتا تھا کہ کوئی ان سیال اندھیروں میں بھی ان کے لیے جاگ رہا ہے اور مسلسل سفر میں ہے۔وادی میں سینکڑوں مکان تھے۔تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر وہ رک جاتا تھا اور مکان کو تاریک اور خاموش پا کر پھر آگے بڑھنے لگتا تھا، پیروں سے پانی اچھالتا ہوا

اندھیروں سے بے نیاز لگتا تھا۔ اس تاریک گنبد میں بھی اسے راستہ صاف صاف دکھائی دے رہا ہے۔ صحیح اور متوازن قدموں کے ساتھ وہ مسلسل بڑھ رہا تھا۔ صد سطری حکم نامے کا کاغذ اب بھی اس کے دائیں ہاتھ میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔

وہ اچانک رکا۔ اس نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں نے معبد کے بھیگے ہوئے شکستہ میناروں کا احاطہ کیا اور پھر وہ تیزی سے پرانے معبد کے دروازے کی طرف بڑھا۔ کاٹھ کا بدرنگ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے آواز لگائی ''پورے زور کے ساتھ میں آ گیا ہوں''.... معبد کا گنبد اس کے الفاظ لوٹاتے ہوئے گونجنے لگا: میں آ گیا ہوں........ میں آ گیا ہوں....... میں آ........

معبد میں کوئی نہیں تھا۔ اس کے اور اس کی آواز کے علاوہ معبد میں اور کوئی نہیں تھا۔ وہ مزید سوچے اور انتظار کئے بغیر اچھل کر منبر پر چڑھ گیا اور اونچی مگر قدرے غیر انسانی آواز میں اذان دینے لگا۔ اس کی آواز یہاں سے وہاں تک وادی بھر میں گونجنے لگی۔ لوگ گہری نیند سو رہے تھے۔ پھر ایک ایک کر کے جاگنے لگے۔ ہر آدمی اپنے طور پر حیران تھا اور خود سے ہی پوچھ رہا تھا: یہ اذان دینے والا کون ہے؟ آدھی رات اور معبد میں اذان۔ آخر یہ کون ہو سکتا ہے؟

معبد کے باہر لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ گئے۔ وہ اب بھی میز پر کھڑا تھا اور اس کی آواز اب بھی فضا میں گونج پیدا کر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ ہر شے سے بے خبر تھا۔ شاید اس کا پورا وجود اس کی آواز بن گیا تھا اور وہ یہاں سے وہاں تک پوری وادی میں گونج رہا تھا۔

جب اس نے آنکھیں کھولیں تو معبد کے اندر باہر ہر طرف لوگوں کا ہجوم تھا۔ نم اندھیروں میں کالی پرچھائیوں نے منبر کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی اب بھی ہو رہی تھی۔

''تم کون ہو؟ اور آدھی رات میں اذان دینے کے لیے تمھیں کس نے بھیجا ہے؟: ایک آواز۔

کیا تم پہاڑ سے اتر کر ادھر آنے والے پہلے آدمی ہو؟ دوسری آواز۔

اس نے اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی اور اپنا دایاں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا: میں صد سطری حکم نامہ لایا ہوں۔''

اس پر سب نے اصرار کیا کہ یہ حکم نامہ انہیں پڑھ کرسنایا جائے۔مگر اس نے جواب دیا: مجھے یہ حکم نامہ پڑھ کرسنانے کی اجازت نہیں ہے۔"

یہ سن کر ایک نوجوان آگے بڑھا: لاؤ۔۔۔اسے میں پڑھ کرسناتا ہوں۔"

"نہیں" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ مجھے فرمایا گیا ہے کہ یہ حکم نامہ وادی کے لوگوں کو اس وقت پڑھ کر سنایا جائے جب مجھے قبر میں اتارا جائے۔" چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ پھر سرگوشیاں ہونے لگیں۔ پھر چاروں طرف شور مچ گیا۔ہم تمھاری موت کا انتظار نہیں کرسکتے۔ ہمیں یہ حکم نامہ پڑھ کر سنایا جائے۔.......آج ابھی اسی وقت۔

لوگوں کا ایک بے پایاں ہجوم تھا اور شور تھا کہ بڑھتا ہی جارہا تھا آج ابھی اسی وقت.......

وہ بدستور منبر پر کھڑا تھا۔اس کا چہرہ پرسکون تھا اور وہ بڑی خاموشی سے سب کو دیکھ رہا تھا۔

"ایسا نہیں ہوگا۔" اس نے بآواز بلند کہا: میں ایسا نہیں ہونے دوں گا، یہ میرا آخری فیصلہ ہے......."

کوئی ہجوم میں سے باہر نکلا اور لوگوں سے مخاطب ہوکر بولا: یہ اس طرح نہیں مانے گا، اسے معبد کے احاطے میں زندہ گاڑ دو۔"

یہ سن کر وہ مسکرایا: تم مجھے نہیں مار سکتے۔ اس لیے کہ میری موت کا دن اس وادی کے تمام لوگوں کا آخری دن ہوگا۔"

گہری کالی پرچھائیوں میں ہراس چھا گیا: چاروں طرف ہڈیوں کی سی خاموشی تھی اور تم اندھیروں کا گاڑھا دھواں وادی کے اوپر پھڑ پھڑا رہا تھا۔ پھر پرچھائیوں کے ہجوم کو چیرتی ہوئی ایک پرچھائیں آگے بڑھتی: یہ وادی کا بوڑھا کل پتی تھا جس کا سب لوگ احترام کرتے تھے۔اس نے خاموش پرچھائیوں سے کہا:

عزیزو! ہمیں ان کا کہا مان لینا چاہیے۔ صد سطری حکم نامہ سننے کی ضد چھوڑیئے اور اپنے مہمان کا سواگت کیجیے۔"

سب لوگ بدستور خاموش اور بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ کل پتی نے پھر کہا: اس وادی کی قدیم رسم کے مطابق آپ سب میرے ساتھ مل کر اپنے مہمان کو سلام کریں۔۔۔۔"

یہ سن کر سب لوگوں نے ہاتھ اٹھا کر منبر پر کھڑے ہوئے مہمان کو تین بار سلام کیا۔ کل پتی آگے بڑھا اور اس کے ساتھ پانچ نوجوان کنواری لڑکیاں بھی بڑھیں جنہوں نے مہمان کو سہارا دے کر منبر سے نیچے اتار۔ کل پتی نے اپنے مہمان سے مخاطب ہو کر کہا: آج سے آپ پنچ دیو کے نام سے اس وادی کے خصوصی باشندے کی حیثیت سے رہیں گے اور رواج کے مطابق جن پانچ کنواریوں نے آپ کے جسم کو چھوا ہے، آج سے آپ ان کے شوہر ہیں اور ان کے جسموں کو برتنے کا آپ کو حق ہے۔''

پنچ دیو نے پرسکون خاموشی کے ساتھ کل پتی کا اور دوسرے لوگوں کا سر جھکا کر شکریہ ادا کیا اور صد سطری حکم نامہ کا کاغذ کل پتی کو سونپتے ہوئے کہا: میں یہ حکم نامہ آپ کے حوالے کرتا ہوں۔ فرمایا گیا ہے کہ جب میری موت کے بعد مجھے قبر میں اتارا جا رہا ہوگا تو کوئی شخص پہاڑ سے اتر کر اس وادی میں آئے گا اور وہی یہ حکم نامہ آپ لوگوں کو پڑھ کر سنائے گا۔'' کل پتی نے جھک کر دونوں ہاتھوں سے حکم نامے کے کاغذ کو تھام لیا۔

ایک ایک کر کے سب لوگ معبد سے باہر نکلنے لگے۔ سب سے پیچھے پنچ دیو تھا اور اس کے اغل بغل اس کی پانچ نئی بیویاں جو سر جھکائے چل رہی تھیں۔

جب لوگ معبد سے نکل رہے تھے: دُور مشرقی افق سے ٹھنڈا سرخ اور پستان سا سرخ سورج نمودار ہو رہا تھا۔ بوندا باندی رک گئی تھی۔ دھواں دھار اندھیرے چھٹ رہے تھے اور نحیف اجالوں میں لوگ ایک دوسرے کو صاف دیکھ رہے تھے۔

پنچ دیو اب مستقل طور پر وادی میں رہنے لگا۔ اپنی پانچ بیویوں سے اس نے سینکڑوں بچے پیدا کئے۔ وادی میں اس کے ذمے اس کے سوا اور کوئی کام نہیں تھا کہ وہ ہر شعبے میں وادی کے لوگوں کی رہنمائی کرتا تھا۔ اور وادی کے مختلف تہواروں میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوتا تھا۔

مذہبی معاملات ہوں یا پھر سیاسی یا سماجی معاملات سب میں اس کے مشورے بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ اور اس کی ہدایات پر عمل کرنا وادی کا ہر آدمی بہ مع کل پتی اپنا فرض سمجھتا تھا۔ ہفتہ میں ایک بار پرانے معبد کے احاطے میں ایک عام نشست منعقد ہوتی تھی، جس میں وادی کے مختلف

تازہ مسائل پر پنج دیو اپنے خیالات کا اظہار کرتا تھا۔

لیکن ایک روز جب وادی کے کچھ بزرگ صبح کی عبادت کے لیے معبد میں داخل ہوئے تو انہوں نے وہاں ایک عجیب ہولناک منظر دیکھا۔ ہر آدمی سر سے پاؤں تک لرز گیا۔ منبر کے نیچے پنج دیو خون میں لت پت آخری ہچکیاں لے رہا تھا اور اس کے قریب ہی بوڑھا کل پتی کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں لہو بھری تلوار چمک رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور وہ بے حد طیش میں نظر آ رہا تھا۔ سب لوگ پھٹی پھٹی مردہ آنکھوں سے کل پتی کی طرف دیکھنے لگے۔ اس سے پہلے کہ وہ اس سے کوئی سوال کریں، کل پتی نے کہا: کیا دیکھ رہے ہو ـــــ؟ اسے واقعی میں نے قتل کیا ہے۔ اس کا مر جانا ہی بہتر تھا۔"

"لیکن کیوں"؟ سب نے ایک ساتھ پوچھا۔

"اس لیے کہ میں نے صد سطری حکم نامہ پڑھ لیا ہے۔"

لوگ خوف و ہراس کے نشیب میں گرنے لگے: تو کیا آج کا دن ہم سب کا ....اور اس وادی کا آخری دن ہوگا؟

کل پتی مسکرا دیا، اس نے جیب سے صد سطری حکم نامے کا کاغذ نکالا اور اسے کھولا اور کہا: لو تم بھی پڑھو........

لوگوں نے جب حکم نامے کا کاغذ دیکھا تو حیران رہ گئے۔ تڑا مڑا کاغذ بالکل کورا تھا۔ اس پر ایک لفظ بھی رقم نہیں تھا۔

سب لوگ طیش میں آ گئے۔ ان کا خون کھولنے لگا اور معبد سے نکل کر سیدھے پنج دیو کی حویلیوں کی طرف بھاگنے لگے۔ پنج دیو کے سینکڑوں بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اور اس کی پانچ بیویوں کو بے لباس کر کے وادی میں گھمایا گیا اور آخر میں انہیں اسی جگہ لایا گیا جہاں پنج دیو کی لاش کو دفنایا جاتا تھا۔

شام کے دھندلکوں میں پنج دیو کی خون میں لت پت لاش کے ساتھ اس کی بے لباس بیویوں کو بھی زندہ زمین میں گاڑ دیا گیا۔ اور پھر ایک ایک کر کے سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آئے اور گہری نیند سو گئے۔

وادی کے لوگ ابھی تک سو رہے ہیں۔ آسمان گہرے کالے بادلوں سے اٹا ہوا ہے اور پوری وادی تاریک فصیلوں کے درمیان گھری ہوئی ہے۔ پانی مسلسل کئی گھنٹے برسا ہے اور اب بھی ننھی ننھی بوندیں پڑ رہی ہیں۔

کہیں دور کوئی شخص پہاڑ سے اترنے کے بعد تیزی سے وادی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس نے سرخ رنگ کی نکٹائی لگا رکھی ہے اور اس کے دائیں ہاتھ میں صد سطری حکم نامے کا کاغذ پھڑ پھڑا رہا ہے۔

تنگ اندھیرا زینہ

زینہ بہت ہی تنگ و تاریک ہے۔

میں دائیں دیوار کا سہارا لے سوچ سوچ کر قدم اُٹھاتا ہوں مجھے آخری منزل پر پہنچنا ہے جہاں ایک شخص میرا انتظار کر رہا ہے اُسے واقعی میرا انتظار ہے۔ وہ کئی زمانوں سے مجھ سے ملنے کے لیے بے تاب ہے——بہت بے تاب ہے.........

اور میں سوچ سوچ کر قدم اُٹھا رہا ہوں کہ زینہ بہت ہی تنگ ہے اور تاریک ہے—— ایک، دو، تین——دس——بیس——سو——ایک سو——

میں پائیدان گن رہا ہوں——ارے! میں اتنا زینہ طے کر چکا——اور ابھی—— ابھی مجھے اور اوپر چڑھنا ہے——اور——اور

اور زینہ تنگ ہے اور تاریک اور دائیں دیوار سیلی ہوئی ہے۔ اور میرے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی بھیگ گئی ہے۔ میرا سانس پھولنے لگا ہے۔

لیکن میں اوپر چڑھ رہا ہوں——اوپر——جہاں وہ میرا انتظار کر رہا ہوگا—— اور شاید اپنے کمرے کے باہر دروازے پر کھڑا ہوگا اکیلا اداس اور بے تاب ——

وہ واقعی مجھ سے ملنا چاہتا ہے——مجھے یقین ہے: ہم ضرور ملیں گے۔ نہ جانے اب کیا وقت ہوگا؟

——— کیا وقت ہوگا اب: میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں۔ اندھیرا گہرا ہے اور کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھنا بے کار ہے——— تو گویا میری گھڑی بیکار ہوگئی۔ یہ چل رہی ہے۔ اس کی آواز میں سن سکتا ہوں: ٹک ——— ٹک ——— ٹک.....لیکن یہ بے کار ہے مجھے نہیں معلوم اب وقت کیا ہے اور یہ بھی: کہ باہر رات ہے یا دن۔

کچھ بھی ہو، وہ شخص دروازے پر کھڑا میرا انتظار کر رہا ہوگا——— میز سج چکی ہوگی——— کب کی، نہ جانے کب کی اور اب تو کھانا بھی ٹھنڈا ہو چکا ہوگا۔

وہ میرا انتظار کر رہا ہوگا اور بھوکا ہوگا لیکن وہ اکیلا نہیں کھائے گا۔ اس کی نظر بار بار میز پر رکھے شیشے کے گلاسوں اور مقامی شراب کی بند بوتل پر پڑتی ہوگی اور وہ بار بار بھنے ہوئے تیتر اور تلی ہوئی مرغابی پر نظر ڈالتا ہوگا اور پھر اس کی نظر زینے کی طرف اٹھ جاتی ہوگی———

ابھی نہیں آیا——— نہ جانے کب آئے گا——— نہ جانے کب۔

اس کی آنکھیں سرخ ہوں گی اور پلکیں بھاری۔ وہ سوچ رہا ہوگا: بتی بجھا دے——— اور کھانے کی میز کے پاس کاوچ پر سو جائے——— وہ سوچ رہا ہوگا: شاید وہ آج بھی نہ آئے——— شاید کسی نے اسے روک لیا ہو——— شاید وہ بھول گیا ہو——— شاید وہ بھول گیا ہو کہ اسے یہاں پہنچنا ہے——— شاید وہ بھول گیا ہو کہ میں اس کا انتظار کر رہا ہوں——— شاید وہ بھول گیا ہو——— شاید——— شاید۔

اور سوچ رہا ہوگا بار بار گھڑی کی طرف دیکھتا ہوگا اور پھر اندھیرے زینے کی طرف——— اس کے کان میرے قدموں کی آہٹ سننے کے لیے بے چین ہوں گے بے تاب——— وہ بے تاب ہوگا اور بھوکا ہوگا۔ نیند اس کی آنکھوں میں بھری ہوگی مگر وہ جاگ رہا ہوگا اور دروازے پر کھڑا میرا منتظر ہوگا——— بے تاب، بے چین——— اور اداس———

میں اب بہت اوپر آ چکا ہوں کئی ہزار پائیدان طے کر چکا ہوں اندھیرا گہرا ہے اور زینہ تنگ۔ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا: لگتا ہے کہ میں اندھا ہو گیا ہوں——— اور نہ جانے کب سے بے آواز قدموں کے ساتھ اوپر چڑھ رہا ہوں۔

کھٹ

کھٹ

کھٹ.........

یہ کون ہے ـــــ یہ کس کے قدموں کی آہٹ ہے۔

کھٹ ـــــ کھٹ ـــــ کھٹ ـــــ کھ ـــــ

آخر یہ کون میرا پیچھا کر رہا ہے ـــــ آخر یہ کون ہے ـــــ جو اندھیرے میں میرے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔

خوف سے میرا بدن کانپ رہا ہے ـــــ وہ میرے قریب آ رہا ہے ـــــ اور اب ـــــ اب میں ان کے سانسوں کی آواز بھی سن رہا ہوں ـــــ اندھیرا گہرا ہے اور زینہ تنگ۔

کوئی میرا گلا دبوچ رہا ہے ـــــ پورے زور کے ساتھ میں چیختا ہوں ـــــ مگر میری چیخیں حلق میں پھنس گئی ہیں ـــــ خوف سے میرا بدن کانپ رہا ہے۔

مگر نہیں ـــــ کوئی نہیں ـــــ شاید یہ میرے اپنے ہی قدموں کی آواز تھی اور وہ ہاتھ ـــــ وہ ہاتھ شاید میرا ہی تھا ـــــ میرے گلے کو دبوچتا ہوا ایک سرد اجنبی ہاتھ شاید میرا تھا ـــــ شاید میں مرنے لگا تھا: خودکشی ـــــ لیکن نہیں مجھے اوپر جانا ہے ـــــ اس سے ملنا ہے: وہ بیتاب ہوگا بہت بے تاب ہوگا۔ لیکن یہ درد ـــــ یہ ٹیس ـــــ یہ اندھیرا اور اوپر ہی اوپر جاتا ہوا یہ کبھی نہ ختم ہونے والا زینہ ـــــ

اور اچانک میں کسی چیز سے ٹکرا گیا ہوں ـــــ سامنے دیوار ہے ـــــ میں دونوں ہاتھوں سے اسے چھوتا ہوں، ایک سیلی ہوئی دیوار میرے سامنے ہے ـــــ ایک سیلی ہوئی دیوار میرے دائیں۔

اور مجھے بائیں طرف مڑنا ہے شاید میں اوپر پہنچ گیا ہوں اور اب آخری پائیدان پر کھڑا ہوں۔ سامنے سیلی ہوئی دیوار ہے اور دائیں طرف بھی۔ میں بائیں طرف قدم اٹھاتا ہوں اور دھیرے دھیرے آگے بڑھتا ہوں۔

اور اب میں دیکھ رہا ہوں: سامنے دالان ہے ـــــ چاروں طرف گرد ہے اور خشک پتے ـــــ لگتا ہے شاید یہاں کوئی نہیں رہتا ـــــ صدیوں سے کوئی نہیں رہتا ـــــ کوئی

نہیں —— کوئی نہیں۔

مگر وہ —— اچانک میرے کمرے کی طرف دیکھتا ہوں: کھڑکی کے ذریعے باہر روشنی پڑ رہی ہے۔تو شاید وہ اندر ہے۔

میں دروازے کی طرف بڑھتا ہوں

دروازہ بند ہے

اور اس میں تالا لگا ہوا ہے۔

میں کھڑکی کے شیشوں میں سے اندر جھانکتا ہوں: چھوٹا سا کمرہ ہے۔ایک طرف میز پر کھانا سجا ہے۔درمیان میں شراب کی بند بوتل بھی پڑی ہے۔

اور شیشے کے دو چھوٹے چھوٹے گلاس بھی چکنے، گول اور نازک —— نازک گول اور چکنے ——

لیکن وہ کہاں ہے —— وہ —— ؟

اور میں اُسے آواز دینے لگتا ہوں —— مگر اس کا نام

اس کا نام کیا ہے؟؟

میں زور سے پکارتا ہوں: —— نام کیا ہے؟

اور میری آواز دیواروں اور گنبدوں سے ٹکرا کر واپس آتی ہے:

نام کیا ہے —— نام کیا ہے —— نام کیا ہے ——

اور میں پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتا ہوں۔میرا بدن ٹوٹ چکا ہے۔

میں تھک چکا ہوں —— میں ہار چکا ہوں۔

میری گردن جھک گئی ہے۔

اور اب میں دھیرے دھیرے زینے کی طرف بڑھ رہا ہوں۔

زینہ تنگ ہے : تاریک —— اور طویل ——

اور اب مجھے نیچے اترنا ہے —— نیچے :

میں جلدی جلدی زینہ اتر رہا ہوں ——

ممکن ہے

نیچے

وہ میرا انتظار کر رہا ہو۔

س کا جنم

یے چلتے چلتے اچانک رک گئی اور اس کا بازو پکڑ کر بولی، بس یہاں پھاوڑا چلا دے.......

س نے نیچے دیکھا: ساری زمین پتھریلی تھی اور جہاں اس کے قدم رکے تھے وہاں ایک بڑا سا پتھر زمین سے انچ دو انچ باہر نکل آیا تھا۔

بس چلا دے پھاوڑا یہاں.........

یے کی آواز سناٹے میں چاروں طرف کوندنے لگی۔

س نے نیچے سے دیکھا۔ پھر اس کی نظریں یے کے چہرے پر گڑ گئیں۔ یے کے ماتھے پر، ناک کی سرخی مائل نوک پر اور نچلے لب تلے پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمک رہے تھے۔

دونوں چند لمحوں تک ایک دوسرے کو چپ چاپ دیکھتے رہے پھر اس نے پھاوڑے کے ہتھے کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور اس کے بازوؤں کی مچھلیاں پھڑ پھڑانے لگیں۔

س ایک معمولی کسان کا بیٹا تھا اور بچپن ہی سے پھاوڑے اور زمین سے کھیل رہا تھا، کہتے ہیں:

س کی ماں نے س کو کھڑے ہو کر جنا تھا۔ گاؤں والے یہ بھی کہتے ہیں کہ س کی پیدائش کے سات دن بعد گوتمی مر گئی تھی۔

س نے دونوں ہاتھوں سے پھاوڑے کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ

اس بنجر زمین میں دودھ کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جب سے اس زمین کا گربھ پات ہوا ہے اس کی چھاتیاں سوکھ گئی ہیں اور اب یہ کبھی ہری نہ ہوں گی۔

یے خوشی سے چلا اٹھی۔

دیکھو ـــــ دودھ کی دھار ـــــ کتنی ٹھنڈی ہے اور کتنی میٹھی........

اور یے نے ایک ایک کر کے سارے کپڑے اتار دیئے اور چنگاریوں میں نہانے لگی۔

بستی پر نہ جانے کیا قیامت ٹوٹی تھی کہ سارا اناج جل گیا تھا۔ لوگ دانے دانے کو ترس رہے تھے۔ پہلے تو انہوں نے اپنے پالتو جانوروں کو کاٹ کاٹ کر کھایا ـــــ پھر خوراک کی تلاش میں اندھیرے جنگلوں کی طرف بھاگنے لگے۔

جیسے ہی رات کا آخری ستارہ بجھتا، بستی کے سارے مرد چھوٹی بڑی ٹکڑیوں میں، لوہے اور لکڑیوں کے ہتھیار کاندھوں پر رکھ کر بستی سے نکل جاتے۔ کبھی یوں بھی ہوتا کہ ایک ٹولی کے مرد جب کسی جنگلی سور یا بھینسے کا شکار کر کے، فلک شگاف نعرے لگاتے ہوئے بستی کی طرف لوٹ رہے ہوتے کہ دوسری ٹولی کے لوگ جنھیں (دن بھر کی تلاش و محنت کے بعد بھی کوئی شکار نہ ملتا) ان پر حملہ کر دیتے اور پھر بنجر زمین پر دور دور تک لہو بکھر جاتا........

میں جب بھی اپنے دوستوں کو یہ قصہ سنانے بیٹھتا ہوں محفل بے لطف ہونے لگتی ہے۔ گوسوامی طنزیہ لہجے میں مجھ سے پوچھتا ہے: سمنت ناگ! یہ بتاؤ جب گوتمی نے س کو جنم دیا تھا تب س کی عمر کیا تھی۔؟

ایک طویل قہقہہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک گونجنے لگتا ہے۔

میں ایسے حالات میں غیر استعاراتی زبان کا سہارا لینا ضروری سمجھتا ہوں اور دھیمی آواز میں سب پر یہ راز منکشف کرتا ہوں کہ جب س نے جنم لیا تھا اس وقت س سات برس کا تھا۔

یار لوگ اسے بھی استعاراتی جملہ سمجھ کر بدمزہ ہونے لگتے ہیں، اور اٹھنے کے لیے پہلو بدلنے لگتے ہیں۔ میں پھر کہتا ہوں۔ گوتمی نے س کو پورے سات برس اپنے گربھ میں رکھا تھا......

گوسوامی ہر وقت خوب صورت جملوں کی تلاش میں رہتا ہے۔ وہ پھر پوچھتا ہے: آخر س کا سات کے ہندسے سے کیا تعلق ہے؟

اگر چہ میں گوسوامی کی اس بات کا جواب بڑی تفصیل کے ساتھ دے سکتا ہوں اور یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ یہ کس ہی کی نہیں بلکہ یے کی کہانی بھی سات کے ہندسے کی بار بار تکرار کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ لیکن اس بات کی وضاحت کے لیے مجھے پھر دیومالا کے پانیوں میں اترنا پڑے گا اور پھر بھی یہ طے نہیں کہ میں گوسوامی اور اس کے دوستوں کو مطمئن کر پاؤں گا یا نہیں۔

سیمنار کے ختم ہوتے ہی سب لوگوں نے نندن کو گھیر لیا ہے اور اس سے پوچھ رہے ہیں:

کیا یہ سچ ہے کہ آج رات کو راجدھانی پر حملہ ہونے والا ہے؟

ہاں یہ سچ ہے ـــــ نندن مسکراتا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ دشمن کا کوئی طیارہ ہمارے آسمانوں میں داخل نہیں ہوسکتا۔

تالیوں کے شور میں سب لوگ ایک ایک کر کے باہر نکل رہے ہیں۔ میں ایک طرف کونے میں کھڑا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ کہہ دوں: کل کا سورج اس شہر میں ایک بھی آدمی کو زندہ نہیں دیکھے گا۔

گوسوامی نے شاید میری بات سن لی ہے۔ وہ اداس آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا ہے۔ ہال میں اب صرف تین آدمی رہ گئے ہیں۔ نندن اور گوسوامی اور میں۔

گوسوامی نے آگے بڑھ کر نندن سے پوچھا: میں نے سنا ہے تم شام ہونے سے پہلے پہلے یہ شہر چھوڑ کر کسی محفوظ مقام پر جا رہے ہو۔

اور اس سے پیشتر کہ نندن کہے: آج رات دشمن کا کوئی طیارہ..... گوسوامی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے نندن کا بازو پکڑ کر کہا: اگر ممکن ہو تو میری بیوی کو بھی ساتھ لیتے جاؤ وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے........

ایک ایک کر کے ہال کی سب بتیاں بجھنے لگی ہیں۔ نندن جا چکا ہے اور اب شاید باہر اپنی موٹر اسٹارٹ کر رہا ہے۔ گوسوامی دیوار کا سہارا لیے چپ چاپ کسی اندھی سوچ میں گم ہے۔ لگتا ہے جیسے کسی خوبصورت جملے کی تلاش میں وہ کہیں دور نکل گیا ہے۔

اور پھر صبح ہوتے ہوتے ساری بستی میں شور مچ گیا۔ اس نے شاید انتقام لیا تھا...... لیکن کس سے ـــــ سیاستدانوں سے یا اپنے سات دن کے کل کوتھنے بچے سے۔ بستی کا ہر آدمی جانتا تھا

کہ س بہت ہی سیدھا اور شریف نوجوان ہے۔ وہ کسی کو دکھی نہیں دیکھ سکتا تو کیا یے کا اکیلا پن اس کے ذہن میں نہیں تھا۔ وہ یے کو بہت چاہتا تھا اور اپنے بچے کو بھی کہ جس کو دیکھنا یا چھونا اس کی قسمت میں نہیں تھا۔ مہاپتی نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اگر اسے سات برس سے پہلے دیکھے یا چھوئے گا اسے ناگ ڈس لے گا۔ اور اس موت سے بڑا خائف تھا۔ رات کو سوتے میں چونک چونک پڑتا تھا اور پھر دیر تک موم کی طرح اندر ہی اندر پگھلتا رہتا تھا..........

سات برس ——

سات برس تو بہت ہوتے ہیں۔ راج گری کے آشرم میں دیکھیان دیتے دیتے س اچانک خاموش ہو گیا۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔ یے کا چہرہ اس کے سامنے گھوم گیا۔

کل صبح ہم یہاں سے پراستھان کریں گے۔ یہ ہماری آگیہ ہے۔ افق پر سنہری برادہ بکھرا تو آشرم کے درختوں کے گنجان پتوں میں چیں چیں کرتے پرندے نیم دائروں میں آسمان در آسمان پھیل گئے۔ چاروں طرف سبز پہاڑیاں دھند میں لپٹی ہوئی تھیں۔ پگ ڈنڈی پگ ڈنڈی نوجوان سادھوؤں کے اشلوک گونج رہے تھے۔ ان آوازوں کی جادوئی جھنکار پہاڑوں کی چوٹیوں سے ٹکرا کر لوٹ رہی تھی اور جنگل جنگل شبنم کی طرح برس رہی تھی۔

سات برس ——

سات برس کیا ہوتے ہیں یہ کوئی س کے دل سے پوچھے وہ سات برس تک اپنے گل گوتھنے بچے کو تلاش کرتا رہا۔ یے کے اکیلے پن کا سانپ گلے میں ڈالے ڈالے اس نے بحر و بر کا چپہ چپہ چھان مارا بستی والے کہتے تھے: اب وہ واپس نہیں آئے گا۔ وہ تو اپنی تلاش میں گیا ہے۔ پھر ایک دن یے نے بھی یہ خبر سنی اور قریب قریب چیخ اٹھی۔

نہیں نہیں۔ سب جھوٹ ہے..... جھ جھ دو دو

گوسوامی سات کے ہندسے سے بہت چڑتا ہے میں دیکھتا ہوں کہ وہ کچھ کہنے کے لیے پھر سے پر تول رہا ہے: بھائی سمنت ناگ! اگر تم اس کہانی میں سات کے ہندسے کی جگہ کوئی اور ہندسہ استعمال کر لو تو ہمیں اس منحوس ہندسے سے نجات ملے۔ اس پر سب اس کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں۔

مجھے صرف ایک دن کی مہلت دیجیے۔ میں اس مسئلہ پر غور کرنا چاہتا ہوں۔ اچانک ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک طویل قہقہہ گونجنے لگتا ہے۔

ایک دبی دبی آواز اُبھرتی ہے۔

پھر —— دوسری —— تیسری —— اور چاروں طرف شور ہی شور —— کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔

اب یہ سیمنار ختم کردو۔ وقت بہت ہو چکا۔ اندھیرا چھا رہا ہے۔ لوگوں کو بہت دور جانا ہے —— اور پھر آج رات ...... آج رات اپنے شہر پر دشمن ہوائی حملہ کرنے والا ہے۔ کسی نے بھی اپنے گھر میں چراغ نہیں جلایا —— چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ سب لوگ خاموشی کے ساتھ اپنی موت کے منتظر ہیں ...... گوسوامی اسی طرح چپ چاپ گہرے سمندروں میں سفر کر رہا ہے ...... اور گربھ وتی گوتمی اپنے گھر کے ایک اندھیرے کمرے میں گوبر پتی دیوار کا سہارا لیے ہزاروں برس سے آج بھی اسی طرح کھڑی ہے اور کراہ رہی ہے ....

.... تو شاید ابھی میں نے جنم نہیں لیا ....

زرد گھاس کا سمندر

اور ایک دن شہر کے مختلف علاقوں اور مختلف قوموں کے نمائندے اس تاریخی تکونے میدان میں جمع ہوئے۔ وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے اور اپنے چہرے مہرے اور لباس سے ایک دوسرے سے قطعی مختلف نظر آ رہے تھے۔

جب شنکھ کی آواز میدان میں گونجی تو وہ سب ایک لمبے اور طویل قافلے کی شکل میں پرانے باغ کی طرف روانہ ہو گئے۔ سورج سرمئی سرنگ میں رینگتا ہوا آسمان کے وسط میں نیلگوں پردہ پر آ کر کھڑا ہو گیا تھا ——— بادل دھیرے دھیرے چھٹ رہے تھے۔ اور ایک گرم اور سفید رنگ چاروں طرف پھیلتا جا رہا تھا۔

سفر طویل تھا مگر لوگ بھوکے پیاسے بڑی خاموشی کے ساتھ سر جھکائے چل رہے تھے ——— اور اپنے پیچھے دھول کا ایک غبار چھوڑتے جا رہے تھے اچانک شنکھ کی آواز ایک بار پھر گونجی۔ جو شخص جہاں بھی تھا وہیں کھڑا ہو گیا ——— سورج اب پھر سرمئی رنگ میں چھپ گیا تھا اور ہوا دھیرے دھیرے نیچے اتر رہی تھی۔ قافلے کے اگلے سرے والے لوگ اب پرانے باغ کے پھاٹک تک آ گئے تھے۔ ہر شخص ایک دوسرے کو پرے ڈھکیلتا ہوا آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کاف جو سب سے آگے کھڑا تھا ——— قافلے والوں سے اونچی آواز میں مخاطب ہوا: ''دوستو مجھے اندر جانے کی اجازت دیجیے تاکہ میں تمام حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں اور باہر آ کر آپ کو آگاہ

کروں۔'' اتنے میں آگے کھڑے ہوئے لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی اور اس افراتفری میں بہت سو کے پیر کچل گئے ـــــ اور پھر اتنا شور ہوا کہ کسی کی آواز کسی کو سنائی نہیں دی۔ بظاہر سبھی لوگ ایک دوسرے کو چپ کرانے میں لگے تھے ـــــ مگر شور تھا کہ بڑھتا ہی جارہا تھا۔ کاف اپنے پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر ایک مرتبہ پھر چیخا'' دوستو! آپ کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ آپ اس ملک کے باشندے ہیں جس کا نظم وضبط پورے عالم میں قابل رشک رہا ہے۔ میرے اندر جانے پر آپ لوگوں کو یوں بھی اعتراض نہیں کرنا چاہیے کہ میرے آباواجداد باغبانی کے فن میں ماہر تھے اور میرے والد اپنے وقت کے بہت بڑے اور عظیم باغبان تسلیم کئے گئے تھے۔ اور ہاں ـــــ ہمارے ملک کا قومی نشان جو سفید اور سیاہ رنگ کا پھول ہے، اسے میرے والد نے ہی دریافت کیا تھا اور مجھے فخر ہے کہ مجھے یہ فن وراثت میں ملا ہے۔ میں مختلف پھولوں کو چھوکر یا سونگھ کر بتا سکتا ہوں کہ وہ کس نسل کا ہے اور اس کی کیا تاثیر یا کیا کیفیت ہے۔''

کاف کی اس مختصر تقریر نے تمام لوگوں پر جادو کر دیا اور سبھی نے ایک زبان ہوکر کہا'' اچھا تم اندر جاؤ ہم لوگ باہر تمھارا انتظار کریں گے ـــــ لیکن یاد رہے کہ باہر آکر تم جو کچھ ہم سے کہو گے وہ سب سچ ہوگا۔ اور سچ کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا۔''

کاف نے اثبات میں سر ہلایا ـــــ اور پھاٹک کے اندر داخل ہوگیا۔

اس نے اندر جاکر چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور سر سے پاؤں تک لرز گیا۔ باغ ایک وسیع دائرے میں گھرا ہوا تھا اور اس کے چوگرد سیاہ پتھروں کی شکستہ اور اونچی دیوار تھی۔ باغ کیا تھا ایک اچھا خاصا ویرانہ تھا۔ زرد گھر اس کا ایک چھوٹا سا جنگل ـــــ جہاں کوئی درخت۔ کوئی پودا نہیں تھا ـــــ صرف ٹخنے ٹخنے گھاس تھی ـــــ زرد اور مردہ وہ ڈرتے ڈرتے گھاس کے سمندر میں اترا تو گھاس کی پتیاں ایک ہلکی سی غیر مانوس آواز کے ساتھ ٹوٹنے لگیں ـــــ ایک عجیب ہیبت ناک زردی سارے باغ میں پھیلی ہوئی تھی ـــــ دور ـــــ دائیں طرف ایک گول مٹول سا ادھ کٹا خشک درخت نیچے کی جانب جھکا ہوا کھڑا تھا۔ جس پر کوئی ٹہنی نہیں تھی۔ کوئی پتا اور کوئی پھول نہیں تھا، ایک خشک سیاہ اور ادھ کٹا درخت: جو اس خوفناک زردی میں عجیب مکروہ منظر پیش کر رہا تھا۔

کاف کا دل ڈوب سا گیا۔ تو کیا یہ ہیبت ناک زردی ہی ہمارا مقدر ہے؟ باہر کھڑے ہوئے

لوگوں سے جا کر میں کیا کہوں گا؟ —— کیا میری تمام ذہانت یونہی بے کار چلی جائے گی —— ؟
ہم لوگ کیا کیا امیدیں لے کر یہاں آئے تھے —— ہمارے بزرگوں کو تو کبھی اس طرح ہزیمت کا منہ نہیں دیکھنا پڑا —— اور دھیرے دھیرے اس ادھ کٹے دیو کی جانب بڑھا —— ایک غیر مانوس آواز کے ساتھ گھاس کی پتیاں پھر ٹوٹنے لگیں —— اور اس کے پاؤں کے ساتھ ساتھ ایک ننھی منی پگ ڈنڈی بنتی چلی گئی —— وہ سیاہ دیو کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا —— ایک بار پھر اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی —— ایک زرد سمندر اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا —— اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ باہر کھڑے ہوئے لوگوں سے جا کر میں کیا کہوں —— ؟

کیا میری ذہانت —— کیا میں ——

اور وہ بھاری قدموں کے ساتھ اس ننھی منی پگ ڈنڈی کے راستے پھاٹک کی طرف بڑھا۔ پھاٹک تک پہنچ کر اس نے ایک بار پھر سارے باغ کو یاس بھری نظروں سے دیکھا —— اور جلدی سے باہر نکل آیا۔

باہر لوگوں نے جھپٹ کر اسے اٹھالیا۔ اور اس کی جے کے نعرے بلند کرنے لگے۔ مگر وہ اداس تھا اور خاموش۔ ایک زہر بھری زردی تھی جو اس کی رگ رگ میں سما گئی تھی —— اور جب ہجوم کا زور سنبھلا تو اسے نیچے اتار دیا گیا —— اور ایک ہی سوال مختلف آوازوں کے ساتھ اس کی روح پر تیروں کی طرح برسنے لگا: کاف! اب تم ہمیں اپنی فتوحات سے آگاہ کرو —— مگر کاف خاموش تھا —— اور اداس!

''کاف! ہمارے صبر کا امتحان مت لو —— اور کہو —— خوب کھل کر کہو۔

''کاف —— ''

ک اا اف —— ''

ک ااااا ف ف —— '' —— ''

اور کاف کے شور میں اس نے اپنا سر اُٹھایا اور تھکے تھکے لہجے میں بولا:

دوستو! میں تم سے سچ کہتا ہوں اور سچ کے علاوہ کچھ نہیں کہتا ——

مگر وہ کہتے کہتے رک گیا ـــــ ہزاروں آنکھیں اس کی طرف سوالیہ نشان بن کر اٹھیں۔
ہزار ہا سوالیہ نشان ـــــ مگر ایک ہی سوال تھا صرف ایک، کہو ـــــ خوب کھل کر کہو ـــــ ہمارے صبر کا امتحان مت لو کاف "ک ااا ف ف"

اس نے خود کو سنبھالا ـــــ اور قدرے بھرائی ہوئی آواز میں بولا: دوستو! میں اپنے آپ پر لعنت بھیجتا ہوں اور بزرگوں پر بھی۔ سچ تو یہ ہے کہ ـــــ وہاں کوئی پیڑ۔کوئی پودا، کوئی پتا اور کوئی پھول نہیں ہے۔وہاں تو زرد سمندر ہے جس پر ایک بھیانک دیو حکمران ہے۔

مجمع پر ایک ہراس چھا گیا۔ بہت سے لوگ چیخ کر پیچھے ہٹ گئے اور پھاٹک سے لگے ہوئے چند نوجوان فوراً اچھل کر ہجوم میں گم ہو گئے۔

اور پھر دھیرے دھیرے پورا قافلہ واپس شہر کی جانب چل پڑا

کاف اب سب سے پیچھے، سر جھکائے، چپ چاپ چل رہا تھا گھاس کی پتیاں ـــــ جیسے اب بھی اس کے چلنے سے ایک غیر مانوس آواز کے ساتھ ٹوٹ رہی تھیں۔

جب قافلہ شہر میں پہنچا تو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں منتشر ہو گیا۔اور مختلف بازاروں اور گلیوں کے اندھیروں اجالوں میں ڈوب گیا۔

کاف جب اپنے گھر پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔اس کی دہلیز پر بہت سے اخباری نمائندے کھڑے تھے جنہوں نے اسے آتا دیکھ کر، اسے چاروں طرف سے گھیر لیا اور اس پر سوالات کی بوچھار کر دی۔مگر وہ سب کو پرے ڈھکیلتا ہوا گھر کے اندر داخل ہو گیا ـــــ اس کی بیوی جھپٹ کر اس کے قریب آئی۔اس سے پیشتر کہ وہ کچھ بولے، کاف نے کہا: باہر کچھ لوگ کھڑے ہیں انہیں اندر بلا کر ڈرائنگ روم میں بٹھا لو ـــــ میں منہ ہاتھ دھو کر ابھی ابھی آتا ہوں۔

کافی دیر بعد جب وہ غسل خانے سے نکلا تو اس کا چہرہ کھل رہا تھا اور وہ خاصا تازہ دم نظر آ رہا تھا ـــــ وہ ایک اداکار کی طرح مخصوص انداز میں چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا ـــــ اس نے جھک کر اخباری نمائندوں کو سلام کیا اور پھر ان کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا اور بولا: ہاں تو آپ میرا بیان نوٹ کر لیجیے ـــــ بیان چونکہ خاصہ طویل ہے لہٰذا آج میں آپ کو چند باتیں ہی

بتا پاؤں گا۔۔۔۔۔ اگلی قسط کے لیے آپ کو کل پھر آنا ہوگا۔۔۔۔۔ اخباری نمائندوں نے مسکرا کر اپنی پنسلیں اور کاپیاں نکال لیں۔۔۔۔۔ اور کاف کے پرسکون چہرے کی طرف دیکھنے لگے۔

۔۔۔۔۔ کاف تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوگیا اور پھر کہنے لگا۔ دوستو! میں نے آج جو منظر دیکھا ہے۔ اس کے اثر سے ابھی تک باہر نہیں نکل سکا۔ وہ باغ نہیں۔۔۔۔۔ بلکہ۔۔۔۔۔ '' وہاں تقریباً سو سے اوپر درخت ہیں۔

''۔۔۔۔۔ درخت۔۔۔۔۔؟'' سب اخباری نمائندے چیخے

''۔۔۔۔۔ جی ہاں!۔۔۔۔۔ ایک ایک فرلانگ لمبے درخت

بالکل سیدھے۔۔۔۔۔ اور ان پر پھول بھی ہیں۔

'' لیکن لوگوں نے تو۔۔۔۔۔ '' اخباری نمائندوں نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر کاف نے انہیں ٹوک دیا اور بولا! لوگ کچھ نہیں جانتے میں جانتا ہوں۔ آپ لکھتے رہیے۔۔۔۔۔ وہاں پر پھول بھی ہیں۔

خرگوش کی طرح سفید۔۔۔۔۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ان پھولوں کی خوشبو کچھ ایسی ہے کہ میں ابھی اس کی کیفیت آپ کو نہیں بتا سکوں گا۔

۔۔۔۔۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ میں اس مسئلے پر غور کر کے ضرور کسی خاطر خواہ نتیجے پر پہنچ جاؤں گا۔ فی الحال اتنا ہی یاد رکھیے کہ ان کی خوشبو کچھ ایسی ہے کہ جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔۔۔۔۔ ''

کاف یہ مکالمے ایک منجھے ہوئے اداکار کی طرح ادا کر رہا تھا اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔۔۔۔۔ اور وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر اور منہ بنا بنا کر ایک ایسا بیان دے رہا تھا، جسے سن کر تمام اخباری نمائندے حیران تھے۔

دوسرے دن صبح جب وہ اٹھا تو اس کے گھر کے باہر بہت سے لوگ جمع تھے۔ ان میں سے زیادہ تر وہ لوگ تھے جو کل اس کے ساتھ اس طویل قافلے میں شریک تھے۔

وہ مسکراتا ہوا باہر نکلا اور دہلیز پر کھڑے ہو کر اس نے اونچی آواز میں کہا'' دوستو! میں چونکہ کل بہت تھکا ہوا تھا اور پھر باغ کا عجیب وغریب منظر دیکھ کر خاصا جذباتی ہوگیا تھا اس لیے میں نے وہاں آپ سے جو کچھ بھی کہا وہ سب غلط ہے۔۔۔۔۔ ابھی ابھی اخبارات میں آپ میرا جو بیان پڑھ کر آ رہے ہیں اس کا لفظ لفظ حقیقت پر مبنی ہے۔۔۔۔۔ ''

اتنا کہہ کر اس نے ہاتھ ہلایا اور واپس اندر آ کر ڈرائنگ روم میں جا بیٹھا۔ پل پل ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی۔سوالوں کا ایک ایسا سلسلہ تھا جو ختم ہونے ہی نہیں آ رہا تھا ـــــ شام تک کتنے ہی لوگ جن میں شہر کے رئیس، اس کے دوست احباب، رشتہ دار، سبھی اس سے مل چکے تھے۔ ہزاروں رنگ آ چکے تھے۔ یہاں تک کہ ایک روز ریڈیو سے ایک خاص پروگرام نشر ہوا جس میں اس واقعہ کی تمام تفصیلات بیان کی گئی تھیں۔

اگلے روز بہت سے لوگ اس کے پاس آئے اور انہوں نے اس سے کہا: کاف! ـــــ تم غلط کہتے ہو ـــــ ہم ابھی پرانے باغ سے ہو کر آ رہے ہیں، وہاں نہ تو کوئی پیڑ ہے اور نہ ہی کوئی پودا

پھولوں اور پتوں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ـــــ وہاں تو چاروں طرف ٹخنے ٹخنے زرد گھاس ہے اور ایک ٹھگنا سا مکروہ درخت..........''

مگر کاف نے جواب دیا: ''آپ میری بات کا یقین کریں، اخبارات میں میرا جو بیان شائع ہوا ہے وہ سوفی صد صحیح ہے اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ ایسا لگتا ہے۔ آپ لوگ اپنی بصارت کھو چکے ہیں۔

اور تیسرے دن صبح تمام اخبارات میں کاف کے دلچسپ بیان کی تیسری قسط شائع ہوئی۔ ایک اخبار نے تو اس قسط کا عنوان جمایا تھا۔

''کاف کے شہر میں بیس لاکھ اندھے۔''

ایک اور اخبار نے پورے صفحے پر کاف کی دو آنکھوں کا کلوز اپ شائع کیا اور اوپر جلی حروف میں لکھا تھا :

''عہد حاضر کی دو عظیم آنکھیں۔''

اس کے بعد بھی کئی مہم جوؤں نے بڑے بڑے اور قیمتی لینسز کے ساتھ پرانے باغ کا معائنہ کیا ـــــ مگر سب کو وہاں زرد گھاس اور کالے دیو کے سوا کچھ نظر نہ آیا ـــــ آخر اکتا کر، انہوں نے یقین کر لیا کہ ہمارے شہر کے تمام لوگ اپنی بصارت کھو چکے ہیں۔

اخباروں میں روزانہ کاف کے بیان کی ایک نئی اور سنسنی خیز قسط شائع ہو رہی تھی۔ وہ اب

تک ریڈیو، فلم، ٹیلی ویژن او رملکی اور غیر ملکی ہزاروں اخباری نمائندوں کو انٹرویو دے چکا تھا اور حکومت کی طرف سے اسے متعدد اعزازات بھی مل چکے تھے۔

ایک دوپہر جب وہ لنچ کے بعد ڈرائنگ روم میں صوفے پر اُدھ لیٹا آرام کر رہا تھا تو اس کے ملازم نے اسے اطلاع دی کہ ایک نوجوان اس سے ملنا چاہتا ہے اور وہ پرانے باغ کے سلسلے میں کچھ معلومات لایا ہے۔

کاف نے اسے اندر بلالیا ـــــ بیس بائیس برس کا گہرے سانولے رنگ کا ایک نوجوان پردہ سرکا کر اندر داخل ہوا۔ اس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں ـــــ اور وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اس دوپہر میں بہت دور سے دوڑتا ہوا آیا ہے۔

مسٹر کاف! ـــــ اس نے کاف کو عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ میرا نام نون ہے اور شہر کے جنوب مشرقی علاقے میں میرا قیام ہے ـــــ میں ابھی ابھی پرانے باغ سے آرہا ہوں۔''

یہ سن کر کاف مسکرایا۔ ''تو کیا آپ مجھے زرد گھاس اور کالے دیو کے بارے میں بتانے آئے ہیں........؟''

''جی نہیں ـــــ'' نون نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا

''میں آپ کو حقیقت سے آگاہ کرنے آیا ہوں۔ پرانے باغ میں ایک ایک فرلانگ والے لمبے اور سیدھے درخت بالکل نہیں ـــــ ہیں۔''

کاف پھر مسکرایا۔ ''تو گویا آپ یہ کہنے آئے ہیں کہ وہاں زرد گھاس...........''

نوجوان نے کاف کو ٹوکا۔ ''مسٹر کاف! زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کریں۔ پہلے آپ میری بات سن لیں۔ پھر کہیے گا۔

پرانے باغ میں کل ملا کر ایک ہزار نو سو چھیالیس درخت ہیں جن کے تنے سرخ ہیں ـــــ ٹہنیاں نیلے رنگ کی ہیں اور اس پر پتے کتھئی رنگ کے اور پھول ـــــ۔ پھول بالکل چمگادڑوں کی طرح اُلٹے دم سیاہ ایک دم''

نون بولتا جارہا تھا۔ اور کاف جیسے اندر ہی اندر ڈوب رہا تھا اسے نہیں معلوم کہ اس کے بعد

نون نے اس کیا کہا——وہ اپنے حواس میں تب آیا جب نون کا یہ جملہ اس کے کانوں میں گونجا:
مسٹر کاف آداب میں چلتا ہوں——میرا پورا بیان آپ کل صبح اخبارات میں پڑھیے گا۔
اس وقت بس اتنا ہی یاد رکھیے کہ اس شہر کے 20 لاکھ اندھوں میں آج ایک آدمی کا اور اضافہ ہوا ہے——خدا حافظ'——اور اتنا کہتے ہی وہ چھپاکے ساتھ پردہ ہٹا کر باہر نکل آیا ——ایک زرد اتھاہ سمندر تھا جو کاف کی آنکھوں کے سامنے لہرا رہا تھا اور اس کے کانوں میں گھاس کی پتیوں کے ٹوٹنے کی ایک غیر مانوس آواز گونج رہی تھی۔

ٹوٹی ہوئی رات

وہ آڑی ترچھی ہو کر میرے سامنے کھڑی ہوگئی۔ میں نے دیکھا اس کے گیسو کھل کر بکھر گئے تھے۔ اس کی پیشانی میرے اظہار کی روشنی میں جگمگا رہی تھی۔ اس کے رخساروں پر آنے والی بہار کے نئے پھولوں کے رنگ لرز رہے تھے۔ اور اس کی آنکھوں میں دھیمے دھیمے ایک اداس کر دینے والا نشہ پھیلتا جا رہا تھا۔

وہ پورے وجود اور پورے وقار کے ساتھ میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کا لباس فرش پر بکھرا ہوا تھا۔ اور وہ مجھ سے کہہ رہی تھی! مت سوچ کہ میں کون ہوں۔ اور تیرا کیا رشتہ ہے——بس یہی جان کہ میں تیرے لہو کی قیدگاہ کے باہر ہوں——

اور پھر وہ میرے قریب آ گئی——میں اس کے سانسوں کی پھنکار صاف سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی میں تیرے بچوں کی ماں بننا چاہتی ہوں——اُٹھ!——اور مجھے حاملہ کر——

اور یہ کہتے ہوئے اس کا سارا بدن سرخ ہو رہا تھا اور وہ چراغ کی لو کی طرح جل رہی تھی۔ اس نے اپنے ناخن کی نوک دائیں ہاتھ کی ابھری ہوئی نس میں چبھو دی اور اس سے قطرہ قطرہ لہو ٹپکنے لگا——پھر اس نے اپنا ہاتھ میرے لبوں پر رکھ دیا اور بولی! لے——اسے چکھ!——اور پھر بتا یہ کس کا لہو ہے؟

میں سر سے پاؤں تک لرز گیا۔ میری قوم کے تمام لوگ اپنی اپنی قبروں میں پڑے تھے۔

میں نے لعنت بھیجی اپنے خدا پر ـــــ اپنے لہو کے زوال پر ـــــ اور پھر آڑے ترچھے جسم سے لپٹ کر سو گیا۔ چاند نیچے اتر آیا تھا۔

چھوٹے چھوٹے، گورے چٹے بادل ایک دوسرے کے کاندھوں پر جھکے دھیمے دھیمے چل رہے تھے ـــــ اور ہوا زور زور سے ہانپ رہی تھی۔

دوسرے دن شام تک میں سویا رہا ـــــ خواب میں میں نے دیکھا! میں آپریشن ٹیبل پر پڑا ہوا ہوں مجھے ایکس تھیسیا دینے کے بعد ڈاکٹر نے نشتر سے میرے سینے کو کھول دیا ہے اور اب اس میں سے مداری کی طرح ایک ایک کر کے عجیب وغریب چیزیں نکال رہا ہے ـــــ میری قوم کے لوگ اپنی اپنی قبروں سے نکل نکل کر میری ٹیبل کے گرد جمع ہو رہے ہیں اور میری موت کی دعائیں مانگ رہے ہیں۔

رات تھکی ہاری ٹانگیں پسارے ابھی تک جاگ رہی تھی کہ میری آنکھ کھل گئی ـــــ وہ میری بغل میں پڑی پھپھک پھپھک کر رو رہی تھی ـــــ اس کی آنکھوں میں کتنے ہی سورج ایک ساتھ غروب ہو رہے تھے۔

اوپر آکاش میں چاند کا گولا ٹوٹ کر بکھر گیا تھا اور نیچے گلی میں میرے بزرگ میرا نقلی جنازہ اٹھائے قبرستان کی طرف جا رہے تھے اور خوش تھے کہ آج کے بعد پھر کبھی سورج طلوع نہ ہوگا ـــــ
رات اپنی ٹانگیں پسارے ابھی جاگ رہی ہے ـــــ پھر سو جائے گی اور سوتی رہے گی جب تک کہ ہم اپنی اپنی قبروں میں دھرتی کے بہت نیچے اتر چکے ہوں گے۔

اور میں اگلے روز سارا دن خود کو ہلکا پھلکا سا محسوس کرتا رہا وہ دن میری زندگی کا پہلا دن تھا جب میں نے خود کو دوسروں سے مختلف پایا میں جہاں بھی گیا اور جن جن سے بھی ملا، سبھی کو یہی کہتے ہوئے سنا یہ اپنی قوم کا واحد فرد ہے جس کی تقدیر میں فتح لکھی ہے لیکن جس روز یہ باپ بنے گا۔
اس روز دھرتی پر قیامت آئے گی سمندروں کا پانی اچھل اچھل کر ساری زمین کو زیرآب کر دے گا۔
اور پہاڑوں کی گردنیں ٹوٹ ٹوٹ کر پانیوں میں ڈوب جائیں گی۔

اور جیسے جیسے دن قریب آتے گئے! ہم دونوں اُداس رہنے لگے۔ ہمیں ایک دوسرے سے [illegible] اس کے چہرے پر ہلدی بکھر گئی تھی اس کی آنکھوں تلے کاجل پھیل گیا

تھا اور ہونٹوں کی پتیاں سوکھ کر ٹوٹنے لگی تھیں ـــــ اس کی آدھی چھاتیاں انگیا سے باہر نکل آئی تھیں اور اس کا پچھلا اور اگلا حصہ اس قدر بھاری ہوگیا تھا کہ وہ اگر کہیں بیٹھ جاتی تو پھر اٹھنا مشکل ہو جاتا ـــــ

اور پھر افق پر پھیلی ہوئی سرخی رفتہ رفتہ کالک میں تبدیل ہوگئی۔ اور ایک پیلا اور اداس چاند مٹیالے بادلوں میں سے نمودار ہوا۔ وہ بدستور بجھی ہوئی تھی۔ اس کا سارا لباس فرش پر بے ترتیب پڑا تھا، احساسِ زوال سے اس کی گردن جھک گئی تھی اور وہ بڑی ہی پر درد آواز میں کہہ رہی تھی!

مت سوچ کہ میں کون ہوں! بس یہی جان کہ میں تیرے جسم کی قید گاہ کے باہر ہوں۔

پھر وہ میرے قدموں سے لپٹ لپٹ کر رونے لگی! میں تیری گنہ گار ہوں ـــــ مجھے سنگسار کر ـــــ مجھے سنگسار کر ـــــ

تب سب لوگ اپنی کوٹھریوں میں ایک دوسرے میں الجھے ہوئے سو رہے تھے۔ گلیاں بے رونق تھیں بازار سنسان پڑے تھے اور شہر کی فصیل کے باہر دشمن کی فوجیں تیار کھڑی تھیں۔ ہمیں بتایا گیا تھا: کہ ایسے موقعوں پر ہم اپنے ہتھیار اور اپنے زیورات اپنی عورتیں دشمن کے حوالے کردیں اور بڑی خاموشی اور تحمل کے ساتھ یہ ذلت برداشت کریں۔

اور پھر یہی ہوا! جب دشمن نے صدر دروازے پر یلغار کی ـــ تو بہت سے مردوں نے اپنے ہتھیار ڈال دیئے اور ان کی عورتیں اپنے ہتھیار ڈال دیئے اور ان کی عورتیں اپنے بچوں کو روتا ہوا چھوڑ کر دشمن کے سپاہیوں کی گردنوں میں جھول گئیں۔

میں اپنے مکان کی چھت پر کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ سیاہی پھیلتی جا رہی تھی اور افق پر کھنچی ہوئی سفید لکیر کا جل ہو رہی تھی۔ میں نے دیکھا گہرا نم اندھیرا سب پر چھا گیا تھا بازار اجڑ گئے تھے۔ گلیاں بلک بلک کر سوگئی تھیں اور مکانوں سے بچوں کے سسکنے کی آوازیں رفتہ رفتہ تیز اور خوفناک ہوتی جا رہی تھیں۔ میں نے لعنت بھیجی اپنے ملک پر اپنی قوم پر اور اپنے جسم پر اور ہاتھ میں تیشہ لئے اندھیرے میں نکل کھڑا ہوا۔

چھت کی منڈیر پر ایک بلی منہ اٹھا اٹھا کر رونے لگی۔ اور میں نے سنا کوئی کہہ رہا تھا: رات کے اندھیرے میں بلی کا رونا تو بہت اشبھ ہوتا ہے۔

اچانک میرے پاؤں سے لپٹے ہوئے سانپ کی گرفت مضبوط ہوگئی۔اس نے اپنا سارا زہر میرے لہو میں حل کر دیا——

میں جانتا تھا! وہ مجھے مرنے نہیں دے گی اور پھر وہی ہوا۔

وہ ہجوم کو چیرتی ہوئی میرے قریب آ گئی اور میرا بازو پکڑ کر بولی۔

مت سوچ کہ میں کون ہوں بس یہی جان! کہ تیری قید گاہ سے باہر ہوں۔اور مجھے دشمن کے ہاتھ بک جانے دے——

اور اسی رات سب نے دیکھا! وہ کھلے میدان میں چت لیٹی تھی——اور درد وں سے کراہ رہی تھی——

اور دھرتی کا گولہ، گہرے پانیوں میں ایک ہلکے پھلکے بتاشے کی طرح ڈوب رہا تھا۔

اُس کی لاش

اب خشک اور زہریلے اندھیروں نے پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔
رات کا اژدھا تیزی سے لمبی اور گہری سانسیں لے رہا ہے فصیل کی دیواریں کانپ رہی ہیں۔ لگتا ہے مرگ وحیات کی تمام قوتوں میں پھر وہی پرانی اور بے سبب کشمکش شروع ہوگئی ہے۔ شہر کے آخری کونے والے مکان کے ساتویں کمرے میں کوئی پھر سے بسر ہونے کے لیے جاگنے والا ہے۔ وہ چھٹے کمرے میں چپ چاپ لحاف میں بند چار پائی پر بیٹھا ہے اور مسلسل ایک زنگ زدہ تالے میں کسی اور تالے کی چابی گھمائے جا رہا ہے۔ اس کی ماں کا حکم ہے بچہ پیدا ہونے تک اسے یہی کرنا ہے۔ بڑھیا کو یقین ہے کہ وہ[1] کے ایسا کرنے سے اس کی بہو کی تکلیف کم ہوگی اور بچہ آسانی سے باہر آئے گا۔

اچانک چھٹے کمرے کا چراغ ہوا کے ایک تیز جھونکے سے بجھ جاتا ہے۔ ساتویں کمرے سے بڑھیا کی آواز اُبھرتی ہے۔ بیٹا ذرا اپنے کمرے والا چراغ ادھر لا دے—— گویا ساتویں کمرے میں بھی اندھیرا چھا گیا ہے۔ وہ لحاف پرے پھینک کر چار پائی سے اترتا ہے اور دھیرے دھیرے ہاتھ پاؤں سے راستہ ٹٹولتا ہوا اندھیرے دریا میں آگے بڑھتا ہے۔ اچانک دُور کوئی زنجیر بجنے لگی ہے۔ کسی نے سات کمروں پار دروازے پر دستک دی ہے۔ گھر کے سب چراغ گل ہو چکے ہیں۔ خشک اور زہریلے اندھیروں نے سارے مکان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ زنجیر بار بار بج رہی

ہے۔ ساتھ ساتھ کوئی دروازہ بھی دھپ دھپا رہا ہے۔ تو گویا دروازے پر ایک نہیں کئی آدمی ہیں۔ ایک سے زائد دو، تین، چار یا اس سے بھی زیادہ ـــ مگر آدھی رات میں اور ایسے دل ہلانے والے اندھیروں میں انہیں مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے؟

زنجیر بج رہی ہے۔

دروازے پر دھپ دھپ جاری ہے

اب کسی نے اس کا نام لے کر پکارا ہے

ارے یہ نام تو میرے بچپن کا ہے، صرف میری ماں مجھے اس نام سے بلاتی ہے۔ یہ آدمی یقیناً میرا کوئی پرانا جاننے والا ہے۔ میرے بچپن کا دوست ہو سکتا ہے۔ ایک ایک کر کے کئی چہرے اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگتے ہیں۔

زنجیر مسلسل بج رہی ہے۔

کوئی مسلسل اسے پکار رہا ہے۔

آدھی رات گھرے اندھیرے اور سات کمروں پار کھڑے آدمی آخر کیا چاہتے ہیں؟ بڑھیا کی آواز پھر اُبھرتی ہے ـــ بیٹا ـــ ادھر بڑا اندھیر ہے، چراغ جلدی سے لا ـــ

وہ اندھیرے میں ماچس تلاش کرتا ہے۔ بڑھیا بار بار پکار رہی ہے۔ زنجیر بار بار بج رہی ہے۔

اب کیا کروں؟

اب میں کیا کروں؟

باہر دروازہ زور زور سے پیٹا جا رہا ہے۔ یہ لوگ مجھ سے ملے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔ نہ جانے اس وقت یہ لوگ کیا کرنے آئے ہیں اور مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ وہ دھیرے دھیرے ہاتھ پاؤں سے راستہ ٹٹولتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ ایک کے بعد ایک وہ سب کمروں کو پھلانگ آیا ہے۔ اب وہ حویلی میں کھڑا ہے۔ زمین سے آسمان تک مکمل اندھیرا ہے دروازے کے اس طرف کھڑے ہو کر اس نے سنا، چار مختلف آوازیں اس کے کانوں میں پڑی ہیں۔ گویا یہ لوگ تعداد میں چار ہیں لیکن زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے کچھ لوگ خاموش کھڑے ہیں۔ اس نے دھیرے

سے آواز دی ہے۔ آپ لوگ کون ہیں۔

''ہم ـــــ ''ایک آواز اندھیروں میں بجلی کی طرح کوندی ہے۔

''ہم کون؟'' وہ[1] پھر پوچھتا ہے۔

''وہی ـــــ جنھیں یہاں آنا تھا ـــــ''

''کیوں آنا تھا ـــــ؟''

''سوال مت کرو، چپکے سے دروازہ کھول دو ـــــ'' آواز میں قدرے سختی ہے۔

کئی پرانے چہرے اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گئے ہیں۔ سب آوازیں جانی پہچانی سی ہیں۔ مگر ان سے کوئی واضح صورت سامنے نہیں آتی۔ کون ہو سکتے ہیں یہ لوگ''۔

اس نے دروازہ کھول دیا ہے، ہوا کا ایک تیز جھونکا اس سے اُلجھتا ہوا گزر گیا ہے۔ اندھیرے میں کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ صرف آوازوں کا دھیما دھیما شور ہے۔ وہی چار مختلف آوازیں، پرانی اور جانی پہچانی ـــــ بے ہیئت، بے صوت آوازیں۔

''یہ لو ـــــ بوری کا منہ تھام لو ـــــ'' کوئی کہتا ہے۔ پھر ٹارچ کی روشنی میں اسے ایک بوری نظر آتی ہے، جس کا منہ رسی سے بند ہے۔

ایک آدمی سوال کرتا ہے۔

''کیا یہ اس شہر کا آخری مکان ہے؟ ''

''ہاں ـــــ

''اور اس وقت تم مکان کے چھٹے کمرے میں تھے؟ ''

''ہاں ـــــ

''اور ساتویں کمرے میں تمھاری بیوی بچہ جن رہی ہے۔

''ہاں ـــــ لیکن۔'' وہ[1] حیران ہے ان لوگوں کو یہ سب کیسے معلوم ہوا؟

باہر کھڑے آدمی ایک دوسرے سے کہہ رہے ہیں۔ ''تو ہم صحیح جگہ پر پہنچے ہیں۔ وہ غلط نہیں تھا۔''

وہ[1] پوچھتا ہے: وہ کون؟''

''جواس بوری میں بند ہے۔'' ٹارچ کی روشنی پھر بوری پر پڑتی ہے۔

''کون ہے اس میں؟ وہ گھبرا جاتا ہے۔

''لاش ـــــ ''سب آدمی چلاتے ہیں۔'' اس کی لاش!''

وہ گھبرا کر ایک دم پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ جیسے کوئی پھنکارتا ہوا سانپ دیکھ لیا ہو۔

''کس کی لاش ہے یہ؟'' وہ گھبرا کر پوچھتا ہے۔

''اس کی جس نے ہمیں سب بتایا تھا۔''

''کب بتایا تھا ـــــ اور کیا ـــــ؟''

''مرنے سے تھوڑی دیر قبل اس آدمی نے ہمیں بتایا تھا کہ شہر کے آخری کونے میں اپنے مکان کے چھٹے کمرے میں جو شخص تمہیں ملے ـــــ میری لاش اس کے حوالے کر دینا۔''

''لیکن یہ ہے کون ـــــ؟ ''

''یہ بات ہمیں معلوم نہیں ـــــ ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ آدمی مرنے کے بعد اس شہر کے سات کمروں والے مکان میں جانا چاہتا تھا، یہ اس کی آخری خواہش تھی، جسے ہم نے پورا کر دیا ہے۔''

''لیکن میں اس لاش کا کیا کروں ـــــ؟ ''

''یہ بات ہم کیا جانیں ـــــ '' اتنا کہہ کر وہ واپس مڑ گئے ہیں اور دھیرے دھیرے گلی کے اندھیروں میں بہہ گئے۔

''وہ ڈرتے ڈرتے آگے بڑھتا ہے۔ بوری کو سرے سے پکڑ کر زور لگا کر گھسیٹتا ہے۔ لاش بہت وزنی ہے۔ لگتا ہے کئی دن پرانی ہے۔ شاید میرا مکان تلاش کرتے ہوئے ان لوگوں کو کئی دن لگے ہیں۔ اب میں لاش کا کیا کروں؟ ماں ضرور غصہ ہوگی۔ گھر میں بچہ ہونے والا ہے اور حویلی میں یہ اجنبی لاش ـــ کیسا برا شگون ہے۔ نہ جانے اب کیا ہونے والا ہے۔ زمین سے آسمان تک اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ گھر کی دیواریں جیسے کانپنے لگی ہیں۔ دھرتی کے نیچے ایک گہری، غیر مانوس اور ڈراؤنی آواز چلنے لگی ہے اور اب اس کے تلوؤں کو چھوتی ہوئی نکل گئی ہے۔ وہ کانپنے لگا ہے جیسے بجلی کے ننگے اور زندہ تار پر پاؤں آ گیا ہو۔

بوری کو گھسیٹ کر اس نے حویلی کے عین بیچ میں لاکر رکھ دیا ہے۔ ساتویں کمرے سے ماں کی آواز اب بھی اس تک پہنچ رہی ہے۔ وہ راستہ ٹٹولتا ہوا آگے بڑھنے لگتا ہے۔ اسے پھر چھ کمروں کو عبور کرنا ہے۔

لیکن یہ لاش ـــــــ؟

اسے اکیلا کیسے چھوڑ دوں؟

لاش کو اکیلا چھوڑنا تو برا ہوتا ہے۔ آدمی کو روحوں کا شراپ کھا جاتا ہے۔

روحوں کا شراپ ـــــــ

ایک گہری غیر مانوس اور ڈراؤنی آواز پھر دھرتی کے نیچے چلنے لگی ہے۔ گہرا اور زہریلا اندھیرا سارے شہر میں چھایا ہوا ہے۔ پورا شہر جیسے بلیک آؤٹ کی زد میں ہے۔ وہ[1] پریشان ہے۔ اب میں کیا کروں؟ نہ جانے کتنی رات باقی ہے؟ نہ جانے دن کب ہوگا ـــــــ؟ اور ہوگا بھی یا نہیں، کون جانے؟ لگتا ہے اس رات کے بعد ایک اور لمبی رات شروع ہونے والی ہے۔ ایک او رلمبی رات ـــــــ

ماں نے پھر پکارا ہے ـــــــ بیٹا! چراغ جلدی جلا ـــــــ بہو کی حالت ٹھیک نہیں

کیوں نہ لاش کے بندھن کھول دوں

وہ[1] بوری کا منہ کھولتا ہے، لاش کو باہر نکالتا ہے۔ زہریلی سڑاند سے ساری حویلی لبالب بھر گئی۔ اس نے جلدی سے لاش کو زمین پر لٹا دیا ہے۔ تمام اعضا اکڑ گئے ہیں۔ لاش جس صورت میں ـــــــ

بوری میں پڑی تھی بالکل اسی صورت میں باہر پڑی ہے لگتا ہے اب بھی بوری میں بند ہے۔

وہ[1] اس کے ہاتھ پاؤں سیدھا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر ناکام رہتا ہے۔ پھر دھیرے دھیرے چپ چاپ ساتویں کمرے کی جانب بڑھتا ہے۔

''ماں ـــــــ'' وہ[1] پکارتا ہے۔

''ہاں بیٹا ـــــــ'' ماں کی آواز پر وہ[1] آگے بڑھ رہا ہے۔

''بہو کیسی ہے ماں ـــــــ''

''ٹھیک ہے تم چراغ جلدی سے لاؤ، اندھیرا بہت گہرا ہے۔''

اب وہ[1] ساتویں کمرے میں کھڑا ہے۔ جہاں اس کی بیوی کے کراہنے کی آوازیں اُبھر رہی ہیں۔

''ماں ـــــ میں آ گیا ہوں ـــ''

''تم اتنی دیر کہاں تھے ـــ؟''

''باہر تھا، حویلی میں ـــ؟ ''

''حویلی میں ـــــ؟ کیا کر رہے تھے وہاں؟ ''بڑھیا حیرت سے پوچھتی ہے۔'' کوئی آیا تھا؟ ''

''نہیں تو ـــــ ''وہ جھوٹ بولتا ہے۔ کیسا کسی کو آنا تھا ـــــ؟

''آں ـــ ''بڑھیا بڑبڑاتی ہے'' نہیں ـــ کس کو آنا تھا؟

کون آئے گا اس وقت؟''

اچانک اس کی بیوی چیخنے لگتی ہے۔

''شاید وقت آ پہنچا ـــ'' بڑھیا بڑبڑاتی ہے۔

دیواریں کانپ رہی ہیں۔ دھرتی کے نیچے کئی آوازیں ایک ساتھ چلنے لگی ہیں۔ بہو کی چیخیں کمرے میں پھڑپھڑانے لگی ہیں۔ سارا مکان زلزلے کی لپیٹ میں ہے۔ بڑھیا بار بار خدا کو یاد کر رہی ہے۔ اور وہ[1] مسلسل ایک زنگ زدہ تالے میں چابی گھمائے جا رہا ہے۔

بہو ایک اونچی چیخ مار کر چپ ہو گئی ہے اور اب دھیرے دھیرے سسک رہی ہے۔ چھوٹی چھوٹی اور میٹھی سسکیوں کی موسیقی سارے کمرے میں خوشبو کی طرح پھیل گئی ہے۔ روشن دان سے صبح کی ہلکی کرنیں کمرے میں داخل ہو رہی ہیں۔ بڑھیا کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا ہے اور اس نے بڑھ کر اپنے لڑکے کو بدھائی دی ہے۔ اس نے جھک کر ماں کے پیروں کو چھوا ہے۔

اور اب دھیرے دھیرے کمروں کو عبور کرتا ہوا حویلی کی طرف بڑھ رہا ہے جہاں اس کی لاش پڑی ہے۔

وہ[1] سوچ رہا ہے۔ اب مجھے جلدی سے اس لاش کو حویلی میں دفنا دینا چاہیے۔

وہ پھاوڑا لے کر تیزی سے زمین کھود رہا ہے۔
دُور ساتویں کمرے سے بچے کے رونے کی آواز رُک رُک کر اب بھی آ رہی ہے۔

بانہوں کے گھیرے میں

اس راستے میں آگے جا کے دو دریا پڑیں گے۔

میں جتنا دور جاؤں گا یہ راستہ تنگ ہوتا چلا جائے گا یہاں تک کہ سامنے مجھے ایک ہلکی سی لکیر دکھائی دے گی: ٹیڑھی اور ترچھی۔

لیجیے اب درختوں کا سلسلہ ختم ہوا۔ اس سے آگے سبزہ نہیں ہے —— سامنے ایک پتلی سی سیاہ لکیر ہے اور اس کے دونوں جانب دریا ہیں: شانت اور گمبھیر۔

لکیر کے دائیں طرف دریا کا پانی سیاہ ہے جس میں اپنا چہرہ نہیں دیکھ سکتا۔ لکیر کے بائیں طرف کے دریا کا پانی نیلا ہے۔ ہلکا نیلا اس میں، اگر میں چاہوں تو اپنا چہرہ دیکھ سکتا ہوں: آسمان پر رکے ہوئے سپید بادلوں کی پرچھائیاں بھی دیکھ سکتا ہوں۔ اس دریا کا پانی بہت میٹھا ہے۔ لیکن صحت کے لیے مضر بھی۔ میرے آباواجداد اسی دریا کا پانی پیا کرتے تھے تبھی ان کا زوال ہوا اور وہ اپنے پیچھے مجھ ایسا زوال خوردہ انسان چھوڑ گئے۔

میں اس وقت تنہا ہوں ممکن ہے میرے پیچھے اور بھی چند لوگ چلے آ رہے ہوں لیکن پیچھے اتنی دھند ہے کہ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ کسی کے قدموں کی چاپ بھی مجھے سنائی نہیں دیتی کہ بہت پہلے ایک حادثے میں میں سننے کی قوت کھو بیٹھا تھا۔

درختوں کا سلسلہ ختم ہو چکا۔ دھند رفتہ رفتہ پھیل رہی ہے۔ میرے آگے پیچھے دائیں بائیں

دھند ہی دھند ہے۔اب مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ـــــ نہ آگے جاتی ہوئی پتلی سی لکیر نہ دائیں بائیں کے سیاہ اور نیلے پانیوں والے دریا۔

میرے اوپر، میرے نیچے، میرے دائیں، میرے بائیں، میرے آگے میرے پیچھے دھند کی گدلی دیواریں کھڑی ہیں۔

جب میں گھر سے چلا تھا میں نے احتیاطاً گرم پتلون اور سوئٹر پہن لیا تھا۔ حالانکہ چلتے وقت کافی گرمی تھی لیکن پھر بھی احتیاطاً میں نے ایسا کیا تھا۔ سفر پر نکلتے وقت اس قسم کی احتیاط بہت ضروری ہے۔ اگر واقعی میں برہنہ نکل آتا تو اس وقت میں خاصا پریشان ہوتا اور میری ساری توجہ موسم کی تبدیلی کی نذر ہو جاتی۔

شاید اب میں بہت دور نکل آیا ہوں۔ سڑک بہت تنگ ہوگئی ہے۔ اب میں ایک پیر اٹھا کر اسی جگہ دوسرا پیر رکھتا ہوا چل رہا ہوں اگر میں نے ذرا بھی غفلت برتی تو یقیناً میں دائیں یا بائیں گہرے پانیوں میں گر پڑوں گا مجھے اس وقت سخت پیاس لگی ہے: میرا حلق سوکھا جا رہا ہے۔ میرے پاؤں ٹوٹ چکے ہیں۔ اور پیاس بڑھتی جا رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں ذرا کی ذرا یہاں بیٹھ جاؤں اور چلّو بھر پانی حلق میں ڈال لوں اور تازہ دم ہو جاؤں لیکن میں یہاں بیٹھ نہیں سکتا۔ سڑک یہاں بہت تنگ ہوگئی ہے۔ صرف ایک پیر رکھنے کی جگہ ہے۔ آپ نے کسی تماشا گاہ میں رسہ پر چلتے ہوئے مداری کو تو دیکھا ہی ہوگا بس میری حالت قریب قریب وہی ہے۔ ذرا سا یوں ہوا نہیں کہ گرا نہیں ـــــ

میرے حلق میں کوئی چیز چبھ رہی ہے: بُرا ہوا، مجھے چلتے وقت پانی ضرور پی لینا چاہیے تھا یا پھر تھرماس میں تھوڑی سی ہائی لینڈ چیف ہی ڈال لاتا۔ یہ تھکن اور پیاس اسی سے دور ہو سکتی تھی۔

پانی میرے دونوں طرف بہہ رہا ہے: بہت دھیمے دھیمے ـ بے آواز ـ

میرے آباواجداد ٹھیک لکھ گئے ہیں کہ سفر پر نکلتے وقت ہر طرح کا ضروری سامان لے لینا ضروری ہے۔ کیا معلوم کب کس چیز کی ضرورت پڑ جائے۔ ہمارے بزرگ کتنے سمجھدار تھے پورے پلان کے ساتھ چلتے تھے۔ ہر طرح کی سہولت: ان باتوں پر پوری توجہ صرف کرتے تھے۔ بس ان سے ایک ہی غلطی سرزد ہوئی ہے انہوں نے نیلے پانیوں کو اپنی خوراک بنا ڈالا۔ وہ اگر چاہتے

توشروع ہی سے پانی سے گریز کرتے اور ہمیشہ پھل اور سبزیاں کھاتے اور ہوا کا رس پیتے ــــــ مجھے حیرت ہے کہ یہ سب جانتے ہوئے بھی کہ پانی سے انکا زوال یقینی ہے کیسے اس بدترین شئے کو انہوں نے اپنی عادت میں شامل کرلیا.........

میں اس سفر پر ہوا سے اپنا رشتہ قائم کرنے نکلا ہوں۔ میرے بزرگوں کو ہوا راس نہیں آئی ــــــ لیکن میں تو شروع ہی سے خود کو ہوا سے وابستہ کر چکا ہوں۔

سنا ہے دائیں طرف کا سیاہ پانی صحت کے لیے بہت مفید ہے۔ اس سے ہمیشہ قوموں کا عروج ہوا ہے یہ بھی سنا ہے کہ چاند اسی سیاہ دریا کی کوکھ سے جنما تھا اور یہ بھی سورج نیلے پانیوں کا بیٹا ہے۔ اس بات میں یقیناً آپ کو بھی صداقت نظر آئے گی۔

ــــــ سورج کا زوال ہو چکا: لیکن چاند ــــــ چاند کا زوال نہیں ہوا ــــــ ہو ہی نہیں سکتا!

میرے آباواجداد سورج کے بیٹے تھے اور اس بات پر انھیں فخر تھا۔ لیکن میں اس زوال خوردہ سورج سے وابستہ ہونا نہیں چاہتا: میں اس غلطی کو دہرانا نہیں چاہتا جو میرے بزرگوں سے سرزد ہوئی اور جس کا خمیازہ میں آج تک بھگت رہا ہوں۔

لیجیے: دُھند دھیرے دھیرے چھٹنا شروع ہو چکی ہے۔ دائیں بائیں بہتے ہوئے پانی اب میری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ میرے پاؤں کے نیچے کی زمین کافی چوڑی ہو گئی ہے۔ اب میں بڑے آرام سے چل سکتا ہوں۔

دائیں بائیں آگے پیچھے۔ دور دور تک دیکھ بھی سکتا ہوں........ مُڑ بھی سکتا ہوں........

درختوں کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا ہے۔

موٹے اور ٹھگنے درخت میرے ساتھ ساتھ چلنے لگے ہیں ــــــ

پانی میرے دونوں طرف بہہ رہا ہے: دھیمے دھیمے ــــــ بے آواز

میں پیچھے مڑ کر دیکھ رہا ہوں: دور سے کوئی شخص آرہا ہے........

مجھے اس کا انتظار کرنا چاہیے: میں سامنے درخت سے پیٹھ لگا کر کھڑا ہو جاتا ہوں.......

........وہ بہت دُور سے میرے قریب آرہا ہے........

لو ــــــ اس نے ہاتھ ہلا کر مجھے اشارہ کیا.........

اب وہ تیزی سے ادھر بڑھ رہا ہے.........

میں بھی دھیرے دھیرے ہاتھ ہلاتا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا ہوں——

اب ہم ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہیں۔
تم کون ہو.........؟
میں اس سے پوچھتا ہوں
میں.........میں.........
وہ ہانپ رہا ہے
میں ہوا کا بیٹا ہوں.....اور..........
...اور تم——؟
وہ مجھ سے پوچھتا ہے۔
اب میں اسے کیا جواب دوں: میں سوچنے لگتا ہوں........
اور عین اس وقت ایک زبردست دھماکے کے ساتھ آسمان پر چمکتا ہوا سورج دو ٹکڑے ہو کر دائیں بائیں گہرے پانیوں میں گرتا ہے۔
اب میں اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھے کہہ رہا ہوں:
میں نہیں جانتا بھائی! کہ میں کون ہوں۔ مجھے تو صرف اتنا معلوم ہے کہ اس وقت سارا آکاش میری بانہوں کے گھیرے میں ہے۔اور سورج کے زوال کا باعث میں ہوں—— صرف میں.....

ہوا پتوں میں سرسرا رہی ہے۔
اور وہ سر جھکائے میرے ساتھ ساتھ چل رہا ہے...........

دوسرا آدمی

یخ اور ہولناک چاندنی میں سارا شہر بے سدھ پڑا ہے۔

وہ اپنے مکان کی چھت پر کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھتا ہے۔ سردیوں کی اس رات میں تمام مکانوں کی چھتیں ویران پڑی ہیں۔ اس کے مکان کی چھت شہر میں سب سے اونچی ہے۔ ہر طرف دور دور تک جیسے صدیوں طویل چپ مسلط ہے اور چاند کے ہولناک اجالوں میں سارے شہر پر گہرے اور لمبے سمندروں کا ہراس چھایا ہوا ہے۔

نیچے کمرے میں اپنے نوزائیدہ بیمار بچے کے شور سے تنگ آ کر وہ چھت پر چلا آیا ہے۔ آوازیں اسے پاگل کر دیتی ہیں چاہے وہ گھر کی ہوں یا باہر کی۔ وہ چاہتا ہے ان سے دور بھاگ جائے۔ وہ مسلسل بھاگ رہا ہے۔ شہر کی ہر سڑک پر بھاگ رہا ہے۔ باہر کا شور اسے گھر بھگا لاتا ہے اور گھر کے شور سے اُوب کر قد مچے پھلانگتا ہوا وہ اکثر چھت پر چلا آتا ہے۔ رات اندھیری ہو یا اُجلی، یہاں آ کر نہ جانے کیوں بھیانک خاموشی اسے اچھی لگتی ہے۔

وشال.........ل.........ل..............

و.......ش ش ش ا...ا......ا........ل.......ل.......ل

شا.......ا.......ا.......ل.......وش......ا......ا.......ل.....ل

اچانک اس کا نام فضا میں گونجتا ہے۔ جیسے کہیں دور سے، کسی نے اسے آواز دی ہے۔ وہ

چاروں طرف نظر دوڑاتا ہے۔اس کی آنکھوں تلے ہر طرف دور دور تک، نئے پرانے مکانوں کی چھتیں ویران پڑی ہیں۔یخ اور ہولناک چاندنی ہیں سارا شہر بے سدھ پڑا سو رہا ہے۔

وشال......وش......ا......ا......ل......ل......ل......وش......ا......ا

بار بار اسے لگتا ہے جیسے رک رک کر کوئی اس کا نام لے کر آواز دے رہا ہے مگر کہیں کوئی نہیں ہے۔شاید ان بے آواز لمحوں میں اس کا وہم ہی اس کا نام بن گیا ہے۔اور سرد اور نوکیلی ہواؤں سے بار بار الجھ رہا ہے۔وہ بے چین ہو گیا ہے۔جیسے کوئی ہزار پایہ اس کی کھوپڑی میں سے گزرتا ہوا اس کے سینے میں ریشہ ریشہ پھیل رہا ہو۔

مجھے کیا ہو گیا ہے؟—— آخر میں اس طرح کیوں زہر میں ڈوب رہا ہوں؟—— میرا وہم آخر مجھے کیوں جینے نہیں دیتا——؟

وشال!

وشال!! کیا تم واقعی مرنا چاہتے ہو؟

وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا زینے تک آ گیا ہے اور اب قدمچہ قدمچہ نیچے اتر رہا ہے اور اس کے آگے آگے رینگتا ہوا اس کا سایہ آخری قدمچہ عبور کر کے کمرے میں داخل ہو رہا ہے، اس کی تھکی ٹوٹی بیوی اب سو گئی ہے اور بیمار بچہ پستان کا نپل مسوڑوں میں دبائے چپڑ چپڑ کر رہا ہے۔

ڈور دروازے پر کسی نے دستک دی۔ وہ تیزی سے مڑا ہے حویلی کو پار کرتا، باتھ روم، یورینل، لیٹرن سب کو چھوڑتا ہوا وہ آگے بڑھ رہا ہے اور اب اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا ہے۔باہر ایک جانی پہچانی صورت:

ارے رجنی دت تم؟

رجنی دت کے منہ سے ایک ہلکی سی ڈراؤنی چیخ نکلی ہے۔

اور وہ گھبرا کر سامنے دیوار سے جا لگا ہے۔وہ ہانپ رہا ہے جیسے میلوں سے بھاگتا ہوا آیا ہو۔

کیا بات ہے رجنی دت! تم ایسے گھبرائے ہوئے کیوں ہو۔

اور پھر ایسی سرد رات میں یہاں——

گاؤں سے آ رہے ہو کیا——؟

رجنی دت پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھے جا رہا ہے۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی ہیں۔ دیوار سے پیٹھ لگائے وہ چپ کھڑا ہے۔

رجنی دت ــــــ!

رجنی ــــــ!!

رج.....ج.....ج......ن.....ن.....ی.....ی.....

وشال کی چیخ سے رجنی دت چونکتا ہے۔

مجھے ذرا ہوش میں آنے دو ــــــ رجنی دت جیسے خود کو سنبھال رہا ہے۔ اس نے ہتھیلی سے ماتھے کا پسینہ پونچھا ہے۔

کیسی عجیب بات ہے وشال!! اگر تم ــــــ تم ہو ــــــ تو وہ کون ہے، جو ہمارے گاؤں میں پیپل کے نیچے پڑا اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہے۔ میں اسے ابھی ابھی دیکھ کر آ رہا ہوں۔ وشال! ــــــ وہ ہو بہو تم تھے۔ کوئی یقین نہیں کر سکتا وشال! کوئی یقین نہیں کر سکتا ــــــ میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے تمھیں گاؤں میں پیپل کے نیچے پڑا دیکھا ہے۔

رجنی دت کپکپا رہا ہے، نہ جانے خوف سے یا سردی سے

کچھ دیر پہلے اس نے وشال کو یہاں سے بارہ میل دور ــــــ گاؤں میں پیپل کے نیچے آخری سانسیں لیتے دیکھا ہے۔ وہ یقیناً وشال ہے کوئی اور کیسے ہو سکتا ہے ــــــ کیا وہ اپنے بچپن کے دوست کو پہچانتا نہیں۔ آنکھیں، ناک، ماتھا، ہاتھ، پاؤں ــــــ سب کچھ ویسا ہی۔ اس نے اچھی طرح دیکھا ہے۔ وہ وشال کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس کی آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ پیپل کے تلے مرتا ہوا آدمی یقیناً وشال تھا ــــــ اور اگر وہ وشال تھا تو یہ ــــــ جو میرے سامنے کھڑا ہے ــــــ زندہ اور تندرست ــــــ

وشال مسکرا رہا ہے۔

رجنی دت! تم نے ضرور کوئی خواب دیکھا ہے ــــــ آؤ اندر چلو ــــــ

مگر رجنی دت دیوار سے پیٹھ لگائے چپ کھڑا ہے۔ اس کی آنکھیں بدستور وشال پر ٹکی ہیں۔

کیا تمھیں مجھ پر وشواس نہیں؟ ــــــ میں سچ کہتا ہوں وشال کہ تھوڑی دیر پہلے جس شخص کو

میں نے پیپل تلے مرتے دیکھا ہے، وہ تم ہو——ایک سرد لہر وشال کے تلووں کو چیرتی ہوئی اس کے بدن میں بکھر گئی ہے۔ چاند کے اجالے زیادہ یخ اور ہولناک ہو گئے ہیں اور فضا پر گہرے اور لا نبے سمندروں کا ہراس چھا گیا ہے۔

دونوں چپ چاپ خود سے ڈرے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔

اگر یہ وشال ہے تو وہ کون تھا——

اگر وہ وشال تھا تو یہ کون ہے——

اگر دونوں وشال ہیں——تو

کوئی میرا ہم شکل کیسے ہو سکتا ہے——

اگر ایسا ہے تو کیا ہوگا——

کیا ہم ایک دوسرے کا سامنا کر سکیں گے........

دونوں چپ چاپ، خود سے ڈرے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔

اچانک وشال کی آواز خاموش اجالوں میں بکھرتی ہے۔

رجنی دت! مجھے اس شخص کے پاس لے چلو، میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔

آں——

رجنی دت چونکتا ہے——ہاں، چلو——

اندر کمرے میں وشال کی بیوی بدستور سو رہی ہے اور اس کا بیمار بچہ پستان کا نپل مسوڑھوں میں دبائے اب بھی چپڑ چپڑ کر رہا ہے۔

باہر یخ چاندنی میں سرد ہوا سائیں سائیں کر رہی ہے.........

وشال سائیکل کے ڈنڈے پر چپ چاپ بیٹھا ہے اور رجنی دت جلدی جلدی پاگلوں کی طرح بے سدھ پیڈل گھما رہا ہے۔

اگر وہ وشال تھا تو یہ کون ہے——

ہوا کے تیز نوکیلے اور سرد جھونکے سڑک کے درختوں سے الجھ رہے ہیں۔

رجنی دت جلدی جلدی پیڈل گھما رہا ہے۔

اگر وہ واقعی میرا ہم شکل ہوا تو ــــــ

تو کیا ہوگا ــــ

چاند کے سرد اجالوں کا ہراس ہر شے پر مسلط ہے۔

اور وشال کا سایہ سائیکل کے اگلے پہیے کے تاروں میں تیزی سے چکر کھا رہا ہے۔

پیپل کے آس پاس لوگوں کی بھیڑ لگی ہے۔ چاند کے اجالے اب ملگجے ہو رہے ہیں کہ دن نکلنے ہی والا ہے۔ وشال اور رجنی دت بھیڑ کو چیرتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ملگجے اجالوں میں لوگوں نے شاید وشال کا چہرہ اچھی طرح نہیں دیکھا۔ رجنی دت سے کوئی کہہ رہا ہے: بس ابھی ابھی آخری ہچکی لی ہے بچارے نے۔ مرنا نہیں چاہتا تھا- کہہ رہا تھا: بہت دور سے چل کر آیا ہوں ــــــ

وشال حیران نظروں سے مرے ہوئے آدمی کو دیکھ رہا ہے۔

ایک تیز سرد لہر اس کے تلوؤں کو چیرتی ہوئی اس کے دماغ میں بکھر گئی ہے۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

یہ تو ہو بہو میں ہوں ــــــ

کوئی رجنی دت سے کہہ رہا ہے: مرتے وقت کہہ رہا تھا کہ میرا اس سے ملنا بہت ضروری ہے ــــ میں اس سے ملے بغیر نہیں مرنا چاہتا-

کس سے ملنا چاہتا تھا؟ ــــــ وشال گھبراہٹ میں پوچھتا ہے۔

کوئی نام لے رہا تھا ــــ کوئی عجیب سا نام ــــ

ایک آواز آتی ہے: کہہ رہا تھا یہاں سے کچھ دور ایک شخص رہتا ہے اسی سے ملنا ہے ــــــ شاید وشال نام لیا تھا ــــــ

ہوا کا تیز، سرد اور نوکیلا جھونکا پیپل کے گنجان پتوں سے گزرتا ہوا نکل گیا ہے۔

نہ جانے کون تھا ــــــ

اور مجھ سے کیا کہنا چاہتا تھا ــــــ

وشال!

وشال!! آخر تم کیا کہنا چاہتے تھے مجھ سے؟

رات سے گھر تک

ندی کا پانی تیزی کے ساتھ کنارے کنارے گدلا جھاگ بچھاتا ہوا دائیں طرف بہہ رہا ہے اور وہ بانسوں کے پرانے پل پر سر جھکائے کھڑا، بے چلے اسی تیزی کے ساتھ بائیں طرف دوڑ رہا ہے۔ سامنے کنارے پر گہرے، گھنے اور نم نیلگوں جنگل ہیں جن میں چھپے پرندوں کے شور سے ایک عجیب سی مہک ہے جو سارے جنگل میں گونج رہی ہے۔ وہ ہوٹل سے بہت دور نکل آیا ہے۔ شام اپنے سانولے قدموں سے قدمچہ قدمچہ آکاش سے نیچے اتر رہی ہے۔ کیلاش اب بھی اس کے ساتھ ہے۔ اس کے نتھنوں کی گرم بو کو وہ اب بھی اپنے گالوں پر محسوس کر رہا ہے۔ وہ اب بھی اس کے بال نوچتی اس کے وحشی بازوؤں کے حصار سے نکلنے کی کوشش کر رہی ہے۔

——راکھشس چھوڑ دو مجھے

—— آئی لو یو کیلاش—— آئی لو یو——

—— چھوڑ دو مجھے—— جانے دو—— آئی ہیٹ یو——

وہ پیٹی کوٹ سنبھالتی پلنگ سے نیچے اتر گئی ہے اور سامنے کونے میں کھڑی بریز میر کے ہک لگا رہی ہے۔

—— آئی ہیٹ یو—— آئی ہیٹ یو—— آئی ہیٹ یو——

گہرے، گھنے اور نم نیلگوں جنگلوں میں چھپے پرند شور کر رہے ہیں اور پل پر بے چلے تیزی

کے ساتھ بائیں طرف دوڑ رہا ہے۔

وہ آج دو بجے دوپہر مسوری پہنچ گیا تھا۔ کیلاش اس کے ساتھ تھی۔ دونوں دلی میں رہتے ہیں اور ایک ہی فرم میں کام کرتے ہیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی جانب ایک برس پہلے متوجہ ہوئے تھے اور دفتر کے باہر ایک ساتھ دیکھے جاتے تھے۔ کیلاش کو معلوم نہیں تھا کہ وہ شادی شدہ ہے اور اس کے بچے بھی ہیں۔ شاید اس کی صورت سے یہ ظاہر بھی نہیں ہوتا تھا کہ کیلاش نے من ہی من میں سوچ لیا تھا کہ وہ اس سے شادی کرلے گی۔ ایسا آدرشی پتی کہاں سے ملے گا۔ ایسا نیک، ایسا سوشیل اور ایسا عشق کرنے والا۔ شاید اسے ایسے ہی جیون ساتھی کی تلاش تھی جو اسے بھرپور چاہے، اسے گھمائے پھرائے اس سے بے تکان باتیں کرے۔ فلمی ہیرو کی طرح۔ جب اس نے کیلاش کے ہونٹوں پر پہلی بار کس کیا تو اس کی آنکھیں خود بخود مند گئیں اور وہ کسی انجان جزیرے کی فضاؤں میں ڈوب گئی ——

پھر یہ سلسلہ دور تک چلا گیا۔

یہ سنڈے پکنک، فلم، ریستوران، اسکوٹر، شہر کی لمبی ویران سڑکیں —— ایک دن اچانک جب کیلاش کو پتہ چلا کہ اشوتوش شادی شدہ ہے تو وہ حیران رہ گئی —— اتنا بڑا جھوٹ ——

آخر تم نے مجھ سے چھپایا کیوں؟ وہ بھبھک اٹھی۔

اشوتوش خاصا ہوشیار تھا قہقہہ مار کر ہنس دیا اور اپنی گھبراہٹ کو فوراً ہنسی میں لپیٹ لیا میرا خیال ہے تم نے مجھ سے یہ کبھی نہیں پوچھا کہ میں میرڈ ہوں یا اَن میرڈ ——

—— اگر نہیں پوچھا تب بھی —— کیلاش کی آنکھیں سچ مچ بھر آئیں —— تب بھی تمھیں چاہیے تھا تم بتا دیتے —— سب بتا دیتے۔

—— آخر یہ کیوں ضروری تھا —— ؟ میں نے تم سے کبھی پوچھا کہ تم میرڈ ہو یا ان میرڈ —— ؟

—— تم جانتے تھے ——

—— اس سے کیا فرق پڑتا ہے —— میرے میرڈ ہونے میں اور تمھارے ان میرڈ ہونے میں، تمھارے میرڈ ہونے میں اور میرے ان میرڈ ہونے میں ——

کیسے نہیں پڑتا ـــــ آخر میرے رشتہ دار یہ جان لیں کہ میں ایک میرڈ آدمی کے ساتھ گھومتی ہوں تو میرا کیا ہوگا ـــــ

ـــــ لیکن میں تم سے محبت کرتا ہوں کیلاش ـــــ

ـــــ ہاں ـــــ مگر شادی نہیں کر سکتے ـــــ

ـــــ کر سکتا ہوں ـــــ شاید ـــــ اشوتوش کچھ سوچنے لگا ـــــ شاید کر سکتا ہوں ـــــ

ـــــ لیکن میں نہیں کر سکتی ـــــ

ـــــ کیا ہم دوست بھی نہیں ہو سکتے؟ دو اچھے دوست ـــــ

ـــــ کون اس کا یقین کرے گا ـــــ بتاؤ؟

ـــــ تم اس طرح کیوں سوچتی ہو؟ سچ جانو میں نے کسی بھی لمحہ تمھیں ٹھگا نہیں ـــــ تمھیں جی جان سے چاہا ہے ـــــ تم چاہے مجھ سے اب نفرت کرو لیکن تمہارے ساتھ گذرا ہوا پچھلا ایک برس میں اپنی زندگی سے کیسے نکال کر پھینک دوں؟ کیا تم ایسا کر سکتی ہو؟ کیا پچھلے ہر لمحے کو اپنے جسم سے کاٹ کر کسی اندھے کنوئیں میں ڈال سکتی ہو ـــــ کیا یہ ضروری ہے کہ جسے چاہا جائے اس سے شادی کی جائے ـــــ کیا ہر محبت کا انجام شادی ہے؟ بیوی سے محبت ایک مجبوری ہو سکتی ہے۔ ایک سماجی مجبوری ـــــ لیکن تم سے محبت مجبوری نہیں ـــــ شاید میری کمزوری ہے ـــــ مگر تم یہ نہ سوچنا کہ مجھے اپنی بیوی سے کوئی لگاؤ نہیں ـــــ وہ مجھ سے بہت خوش ہے اسے مجھ سے کوئی شکایت نہیں ـــــ میں نے اسے کبھی ایسا موقع نہیں دیا ـــــ لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں تمہارے بغیر رہ نہیں سکوں گا ـــــ

کیلاش شاید اشوتوش کی سچائی پر ایمان لے آئی۔ دونوں میں یہ طے پایا گیا کہ وہ دوست بن کر بھی رہ سکتے ہیں ـــــ دو اچھے دوست بن کر ـــــ ملاقاتوں کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا ـــــ اگر چہ اشوتوش نے بار بار محسوس کیا کہ اس میں وہ پہلے جیسی گرمی نہیں ہے ـــــ وہ اب بھی اس سے روز شام کو ملتی تھی ـــــ دیر تک ساتھ دیتی تھی ـــــ لیکن وہ جوش و خروش نہیں تھا۔ کس وہ اب بھی اسے کرتا تھا ـــــ وہ اس سے لپٹ بھی جاتی تھی ـــــ گھنٹوں اکیلے میں لپٹی رہتی تھی۔ پھر بھی اشوتوش کو لگتا ہے جیسے یہ سب بناوٹی ہے، شاید یہ پچھلے ایک برس کی محبت کا سود ہے جو اسے

مجبوراً ادا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس نے اشوتوش سے ایک بار پوچھا بھی تھا ـــــ کیا اس سب کے لیے تمہارا اپنی مسز سے پیٹ نہیں بھرتا ـــــ

سن کر اشوتوش نے بازو ڈھیلے چھوڑ دیے تھے اور کیلاش اس کی آغوش سے نکل کر اپنا بلاوز درست کرتی مسکرا دی تھی۔

ـــــ تمھیں ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا کیوں؟

ـــــ تم میری دوست ہو ـــ تم سے میرا ایک رشتہ ہے۔

ـــــ کیا دوستی میں یہ سب بھی ضروری ہے؟

ـــــ دوستی ہی میں نہیں بلکہ زندگی میں بھی سیکس ضروری ہے اور کیلاش ہنس دی تھی گویا طنز کر رہی ہو۔

ـــــ شاید تمھارے اندر عورت نہیں ہے۔

ـــــ تو کیا ہے؟

ـــــ اگر ہے بھی تو تم نے اسے اپنے جسم کی قبر میں گاڑ دیا ہے اور کیلاش ہنس دی تھی گویا طنز کر رہی ہو۔

شام اپنے سانولے سلونے قدموں سے قدم بہ قدم آکاش سے نیچے اتر آئی ہے۔ اور گہرے گھنے نم جنگلوں میں بکھر گئی ہے۔

اشوتوش کچھ دیر پہلے ہوٹل میں تھا، کیلاش کے ساتھ۔ وہ دونوں دوپہر دو بجے مسوری پہونچے تھے۔ اشوتوش شاید کیلاش کے جسم کی قبر کھود کر اس میں دبی عورت کو باہر نکالنے یہاں آیا تھا۔ لنچ کے بعد وہ دونوں ایک ہی پلنگ پر لیٹ گئے۔ اشوتوش نے اس کے بلاوز کے ہُک کھولے تو وہ سردی میں سمٹتی چپ پڑی رہی۔ وہ اس سے لپٹ گیا اور اس پر بوسوں کی بوچھار کر دی۔

ـــــ وہ ہلکے ہلکے سسک رہی تھی اور اشوتوش اس میں کھبا جا رہا تھا شاید وہ اسے جتا دینا چاہتا تھا کہ وہ ایک عورت ہے، ایک زندہ گرم سلگتی ہوئی عورت ـــــ کھڑکی سے جھل جھل ہوا آ رہی تھی اور اشوتوش جل رہا تھا۔ کہیں دور بیابانوں میں کوئی ننگے پیر چلتا ہوا زمین کا آدمی سرا چھو لینا چاہتا تھا۔ سامنے میز پر کیلاش کی ساڑھی کا انبار پڑا تھا ـــــ پلنگ تلے اس کا میلا مسلا

ـــــ آئی لو یو کیلاش ـــــ آئی لو یو ـــــ

جیسے دور جنگلوں میں کوئی گا رہا تھا، ہلکی میٹھی اور پُر سوز آواز میں

ـــــ ہٹو ـــــ چھوڑو مجھے ـــــ

ـــــ آئی لو یو ـــــ

ـــــ تو کیا تم ـــــ اس لیے یہاں لائے تھے مجھے؟

کھڑکی سے جھل جھل ہوا آ رہی تھی اور اشوتوش چپ چاپ جل رہا تھا ـــــ

ـــــ بولو ـــــ جواب دو ـــــ

ـــــ ہاں ـــــ آئی لو یو ـــــ

اشوتوش نے اسے اور کس لیا

ـــــ بہت نیک بنتے تھے ـــــ راکھشس.......

وہ پیٹی کوٹ سنبھالتی پلنگ سے نیچے اتر گئی۔

ـــــ آئی ہیٹ یو ـــــ آئی ہیٹ یو ـــــ آئی ہیٹ یو ـــــ

گہرے گھنے اور نم جنگلوں میں چھپے پرندشور کر رہے ہیں۔ اشوتوش بانسوں کے پل پر سر جھکائے خاموش کھڑا ہے اور بے چلے تیزی کے ساتھ پانی کے بہاؤ کے الٹ دوڑ رہا ہے۔ دور ہوٹل کا نیون سائن سرخ رنگ میں چمچمانے لگا ہے۔ وہ تھکے قدموں سے پگڈنڈی پگڈنڈی، اندھیرے میں راستہ ٹٹولتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے اور سوچ رہا ہے:

شاید کیلاش اب تک ہوٹل چھوڑ کر جا چکی ہوگی۔

سینتیس برس پرانا آدمی

اس نے اپنی چھڑی سے پھر میرا دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔ میں اٹھ کر دروازے تک آ گیا ہوں۔ پردہ ہٹا کر شیشے میں سے باہر دیکھتا ہوں۔ وہی ہے ہاتھ میں چھڑی لیے اداس اور نراش مٹی مٹی چہرہ، اجاڑ بال اور چھوٹی چھوٹی نم آنکھیں چھڑی کے ہتھے کو دروازے کے کاٹھ والے حصے پر اس نے پھر تین بار ہلکے ہلکے مارا ہے۔ میں نے دھیرے سے دروازہ کھول دیا ہے۔

—— کیا ہے؟

—— چلو ——

—— کہاں؟

—— تم کپڑے بدل کر باہر آؤ اور میرے ساتھ ساتھ چل دو۔

—— لیکن کیوں؟

—— تمھارے اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔ میں جو کہتا ہوں وہی کرو —— اور کپڑے بدل کر چل دو —— اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ مجھے پھر غصہ آ جاتا ہے: ''جاؤ راستہ لو اپنا، میرے پاس بیکار باتوں کا وقت نہیں'' اور پھر ایک تیز کھٹ کے ساتھ میں دروازہ بند کر دیتا ہوں۔

عجیب آدمی ہے گذشتہ کئی برسوں سے میرے پیچھے پڑا ہے ایک مرتبہ روز بلا ناغہ میرے پاس

آتا ہے، اسی طرح چھڑی سے دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ لاکھ نہ چاہنے پر بھی میں دروازہ کھول دیتا ہوں۔ اس کا ایک ہی سوال ہے: میرے ساتھ چلو—— کہاں؟ یہ اس نے کبھی نہیں بتایا۔ روز مجھے اس پر غصہ آتا ہے۔ لیکن روز جب تین بار دروازہ کھٹکتا ہے تو مجھ سے رہا نہیں جاتا۔ نہ جانے کیوں اسے دیکھنے کی اچھا میرے من میں جاگ جاتی ہے پہلے تو سوچتا ہوں اسے گالی دے کر بھگا دوں گا یا اسی کی چھڑی کے ہتھے سے اس کی شاندار پٹائی کروں گا—— اس کے آتے ہی نہ جانے کیا ہو جاتا ہے مجھے؟ کبھی کبھی تو سچ کہتا ہوں—— جی میں آتا ہے اس کے ساتھ ساتھ چل دوں۔ دیکھوں تو آخر کہاں لے جاتا ہے—— ممکن ہے وہ سچ کہتا ہو، اسی میں میری بھلائی ہو۔ لیکن ہمیشہ وہ اپنا پرانا سوال لے کر نمودار ہوتا ہے اور ہمیشہ میں پرانا جواب دہرا دیتا ہوں۔ قدرے غصے کے ساتھ۔ ایک بات اور بھی کہہ دوں، اس سے جھگڑتے مجھے ڈر لگتا ہے واقعی یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ اب چاہے کوئی مجھے بزدل ہی کیوں نہ کہے لیکن یہ ہے سچ۔

دروازہ میں نے بند کر دیا ہے۔ ایک آدھ منٹ رک کر پردہ ذرا کی ذرا سرکاتا ہوں۔ وہ چھڑی بغل میں دابے دھیرے دھیرے سر جھکائے جا رہا ہے۔ دور تک جاتی تارکول کی لمبی اور ویران سڑک پر ایک وہی اکیلا آدمی ہے جو سر جھکائے دھیرے دھیرے جا رہا ہے۔ میرے گھر کے دروازے سے دور—— نہ جانے کہاں؟ شاید وہاں جہاں وہ مجھے لے جانا چاہتا ہے آخر کہاں لے جانا چاہتا ہوگا؟ شہر کے کس کونے میں؟ کیا اس شہر کے بھی باہر کہیں اور—— لیکن کہاں اور کیوں؟ وہ اکیلا کیوں نہیں جاتا؟ کیا میرا اس کے ساتھ جانا ضروری ہے؟

کتنے ہی ایسے وچار کرتے ہیں۔ پھر اپنے کاموں میں ایسا اُلجھ جاتا ہوں کہ کسی بات کا دھیان نہیں رہتا۔ ہاں اکثر رات کو سوتے سوتے چونک کر اُٹھ بیٹھتا ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ میرے کمرے کی دیواریں دور ہوتی جا رہی ہیں۔ تیزی کے ساتھ جیسے فلم چلتی ہے۔ چھت اوپر ہی اوپر اڑتی جاتی ہے اور زمین گویا لفٹ کی طرح پوری رفتار سے منزل در منزل نیچے اترنے لگتی ہے اور تب یوں محسوس ہوتا ہے جیسے صدیوں سے یونہی کسی لفٹ میں نیچے اُتر رہا ہوں—— ایک ایسی لفٹ میں، جس کا کوئی گراؤنڈ فلور نہیں۔

خوف سے سینہ گھٹنے لگتا ہے۔ مرجاؤں گا ابھی—— بس دو چار سانسوں ہی میں دم نکل

جائے گا، کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوگی ـــــ اتنے بڑے اور اتنے ہولناک پھیلاؤں میں خود کو سمیٹنے کی کوشش کرتا ہوں آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا چہرہ دیکھتا ہوں۔

ـــــ کیوں ـــــ کیا ہوا؟

خود سے سوال کرتا ہوں۔ آنکھوں میں آنکھیں کھبو کر کچھ جاننے لگتا ہوں۔ کیسی عجیب سی لگتی ہے اپنی صورت ـــــ لگتا ہے کسی اور کو دیکھ رہا ہوں، کسی اجنبی کو جو مجھے اور بھی خوف زدہ کر دیتا ہے۔ گھبرا کر دروازہ کھول دیتا ہوں اور باہر سڑک پر نکل آتا ہوں ـــــ

دور تک رینگتی تارکول کی لمبی سڑک ہے اور اپنے گھر کے دروازے کے باہر ایک سرے کھڑا ہوا میں ہوں۔

اپنے گھر کے دروازے کے باہر ایک سرے پر کھڑا ہوا میں ہوں دور تک رینگتی تارکول کی لمبی سڑک ہے۔

اور ان دو کے بیچ میری بصارت ہے۔

پھر اچانک میں دیکھتا ہوں سامنے دور، بہت دور سے کوئی آ رہا ہے۔ بغل میں چھڑی دابے وہی جانا پہچانا، اُداس اور نراش، مٹی مٹی چہرہ اور میں ڈر کر گھر کے اندر بھاگتا ہوں اور کھٹ کے ساتھ دروازہ بند کر لیتا ہوں۔

کھٹ ـــــ کھٹ ـــــ کھٹ ـــــ تین بار دروازے کے کاٹھ والے حصے پر چھڑی کا ہتھہ ہلکے ہلکے پڑتا ہے۔ میں دوڑ کر دروازہ کھول دیتا ہوں۔ مگر باہر کوئی نہیں ہوتا سڑک کے اس سرے سے اُس سرے تک میری آنکھیں بھٹکنے لگتی ہیں۔

سڑک کا یہ سرا ہے اور وہ دوسرا سرا ہے

اور ان دونوں کے بیچ میری بصارت ہے

ساتوں رشی میری آنکھوں میں گھس کر سسکنے لگتے ہیں۔ شاید کوئی مر گیا ہے ـــــ دھیرے دھیرے ماتم کرنے والوں کی آواز تیز ہوتی جاتی ہے بہت سے مل کر چھاتیاں پیٹنے لگتے ہیں ـــــ بہت سے مل کر چلانے لگتے ہیں، خوفناک آوازوں میں۔ صاف لگتا ہے کوئی مر گیا ہے ـــــ

میں پھر دروازہ بند کر کے کمرے میں آ جاتا ہوں۔ آئینہ میرے روبرو ہے۔ میں، میں کے

روبرو ہےاوران دو کے بیچ بصارت ہے: میں کی اور میں کی۔

اب میں نے سوچ لیا ہے وہ آئے گا تو میں اس سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ وہ آئندہ ادھر نہ آیا کرے اگر وہ تب بھی باز نہ آیا تو اس کی شاندار پٹائی کروں گا یہاں تک کہ اسی کی چھڑی سے اس کا دماغ پھاڑ ڈالوں گا۔ جیسے بچے ننھی منی ٹہنیوں سے دریا کا سینہ پھاڑ ڈالتے ہیں۔ اب میں نے سوچ لیا ہے۔ وہ اگر باز نہ آیا تو زندہ نہیں بچے گا۔

کمرے میں ایک نظر ڈالتا ہوں، بیوی بچے سب سو رہے ہیں۔ ان کو کیا معلوم کہ میں اب تک جاگ رہا ہوں کیوں جاگ رہا ہوں—— سوچتا ہوں بیوی کو جگادوں اور اس سے کہوں—— کیا کہوں اس سے؟ میں اس سے یہ کہوں کہ میں نے ایک ساتھ بہت سوں کو مرتے دیکھا ہے۔ اگر میں اس سے یہ کہوں کہ میں نے ایک ساتھ بہت سوں کو خوفناک آوازوں میں چلاتے دیکھا ہے تو کیا وہ میرا یقین کرے گی؟ اگر میں اس سے یہ کہوں کہ سات رشی میری آنکھوں میں گھس کر سسک رہے ہیں تو کیا وہ مجھ پر ایمان لے آئے گی؟ اگر میں کہوں کہ ایک طرف میں ہے اور دوسری طرف میں ہے اوران دونوں کے بیچ بصارت ہے تو کیا میرے بچے مجھ پر ایمان لے آئیں گے؟

کمرے میں سب سو رہے ہیں۔ اب ان کو کون بتائے کہ میں کیوں جاگ رہا ہوں۔ غسل خانے کے نل سے بوند بوند پانی نیچے فرش پر گر کر آواز کر رہا ہے۔ رات ابھی باقی ہے کہ ماتم جاری ہے۔ بہت سے مل کر اب بھی شاید چھاتیاں پیٹ رہے ہیں۔ میری بصارت باہر، سڑک کے اُس سرے سے اِس سرے تک بھٹک رہی ہے۔ میں نے دیکھا ہے۔ وہ سامنے دور بہت—— دور سے چلا آرہا ہے، چھڑی بغل میں دبائے۔ تیز قدموں کے ساتھ—— میں ڈر کر اندر آ گیا ہوں اپنے کمرے میں کسی نے کھٹ سے دروازہ بند کرلیا ہے۔ کمرے میں سارے فرش پر کانچ کے ٹکڑے بکھرے پڑے ہیں۔ سارے فرش پر میرے لہو بھرے پیروں کے نشان ہیں، تازہ لہو کے نشان——

کھٹ!

کھٹ!!

کھٹ!!!

کسی نے تین بار دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔ڈر سے میرا کلیجہ گھٹنے لگا ہے۔پسینہ پسینہ میں اچک کر قریب کی چار پائی پر جا بیٹھا ہوں اور جلدی سے لحاف اٹھا کر بیوی کے پستانوں سے چمٹ گیا ہوں۔

دھیرے دھیرے ماتم کرنے والوں کی آواز تیز ہو رہی ہے۔

بہت سے مل کر چھاتیاں پیٹ رہے ہیں۔

بہت سے مل کر چلا رہے ہیں،خوفناک آوازوں میں۔

شاید کوئی مر گیا ہے۔

آدمی نامہ

میگھ دت کو ٹرین پر سوار کرنے کے بعد، میں اب اسٹیشن کے احاطے سے باہر نکل آیا ہوں۔ میگھ دت میرا پرانا دوست ہے۔ دو روز پہلے وہ میرے شہر میں مجھ سے ملنے آیا تھا۔ برسوں بعد ہم دونوں ملے تھے۔ ڈھیروں باتیں تھیں ڈھیروں سوال تھے اب جب کہ وہ پھر مجھ سے ایک نامعلوم عرصے کے لیے بچھڑ گیا ہے۔ لگتا ہے کتنی ہی باتیں تھیں جو میں اس سے نہ کہہ سکا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بھی ٹرین میں بیٹھا میرے ہی بارے میں سوچ رہا ہوگا۔ نہ جانے کتنی باتیں ہوں گی جو وہ مجھ سے کہہ نہ سکا۔

میں اب اسٹیشن کے احاطے سے باہر نکل آیا ہوں۔ رات کا ایک بجا ہے آسمان پر گھرے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ جولائی کی بارشوں میں بھیگنا بھی ایک ننھی منی عیاشی سے کم نہیں۔ یہی سوچ کر دھرتی پر چھلچھلاتے پانیوں میں گھر کی طرف نکل پڑا ہوں۔ اسٹیشن سے میرا مکان دو فرلانگ سے زیادہ دُوری پر نہیں۔ ایک فرلانگ کا اجاڑ علاقہ طے کرنے کے بعد ایک فرلانگ لمبا بازار ہے۔ جس کے آخری سرے پر ایک تنگ سی گلی میں مجھے مڑ جانا ہے۔ دائیں طرف ایک چھوٹی سی حویلی ہے، جس کے باہر ہمارا کمرہ میرا گھر ہے۔ جس کا نہ کوئی دالان ہے نہ آنگن بس ایک چھوٹا اداس سا ہے۔ جس میں ایک چارپائی ہے۔ ایک میز ایک کرسی۔ ادھر ادھر بکھری ہوئی کتابیں، رسالے، اخبار اور دیوار پر فریم میں لگی ہوئی ایک پینٹنگ اور ہماری چیزیں

میری ذات کی پہچان بن گئی ہیں۔ میگھ دت نے سچ کہا تھا: بڑا ہولناک ہے یہ منظر..... لگتا ہے تمہارے کمرے میں نہیں بلکہ خود تمہارے اندر بیٹھا ہوں..........

اسٹیشن کے باہر کا اجاڑ علاقہ طے کرنے کے بعد اب میں اپنے بازار سے آ رہا ہوں۔ پانی اسی رفتار سے گر رہا ہے۔ ہر طرف گہری خاموشی ہے۔ اور اوپر بجلی چمکتی ہے تو بازار کے آخری سرے تک لمحہ بھر کے لیے روشنی سی بہنے لگتی ہے۔ دونوں طرف کی دوکانیں بند پڑی ہیں۔ چوکیدار سر پر بوری لپیٹے دوکان کے تالے چیک کر رہا ہے۔ دھرتی پر پھیلے پانی کو پاؤں سے اچھالتا ہوا میں آگے بڑھ رہا ہوں۔ بس چند دوکانوں کے بعد مجھے دائیں طرف ایک گلی میں مڑ جانا ہے۔ سر سے پاؤں تک بھیگ رہا ہوں۔ کپڑے جسم سے چمٹ گئے ہیں۔ سر کے بالوں سے پانی کی بوندیں رینگ رینگ کر آنکھوں میں گر رہی ہیں اور ایک عجیب سی ٹھنڈک میری روح میں اتر رہی ہے۔

گھنٹہ بھر پہلے میگھ دت میرے کمرے میں بیٹھا تھا۔ آنے والی ایک نامعلوم عرصے کی جدائی کے دکھوں نے ہم دونوں کو اُداس کر دیا تھا۔ وہ بھی میری طرح بہت جذباتی ہے، کہہ رہا تھا: جاتے ہوئے تمہارا کمرہ ساتھ لئے جا رہا ہوں......جو مجھے کہیں بھی چین نہیں لینے دے گا.......میگھ دت کی بھرائی ہوئی آواز میرے ذہن کے گنبد میں بار بار گونج رہی ہے۔

میں اس شہر میں تین چار برس پہلے آیا تھا۔ یہاں کی پرانی عمارتیں دیکھنے۔ لیکن اس شہر کے سکون نے مجھے یہاں سے نکلنے نہیں دیا۔ اور اب تو کچھ ایسی بیڑیاں پڑ گئی ہیں پاؤں میں کہ کہیں اور بھاگ نہیں سکتا۔ شاید چاہنے پر بھی نہیں۔

پانی اسی تیزی سے دھرتی کو پیٹ رہا ہے۔ ہر طرف گہری خاموشی ہے اور اندھیرا۔ اچانک گلی میں مڑنے لگا ہوں تو چونک کر ایک دم رُک گیا ہوں۔ اپنے کمرے کے دروازے پر سائبان کے نیچے ایک سایہ نظر آیا ہے۔ خوف کی ایک لہر میرے سارے بدن کو چیرتی ہوئی نکل گئی ہے میں جرات کر کے آگے بڑھتا ہوں۔ گہرے اندھیروں میں بجلی پل بھر کے لئے چمکی ہے، کوئی دروازے پر کھڑا ہے۔

''کون ہیں آپ؟____ ''

اب میں بالکل اس کے سامنے کھڑا ہوں۔ اگرچہ اندھیرے میں اس کی شکل نہیں دیکھ پا رہا

ہوں۔

کون ہیں آپ؟ کیا چاہتے ہیں؟ ''

پھر ایک آواز آتی ہے۔

''بھائی مسافر ہوں۔ بارش ہو رہی تھی۔ ذرا آپ کے چھجے کے نیچے رُک گیا.........''

میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوں اور آگے بڑھ کر کمرے کا تالا کھولتا ہوں آیئے ——— اندر آ جایئے ——— بارش تھمے تو چلے جایئے گا.....

وہ کچھ کہے بغیر میرے پیچھے ہولیا ہے۔

چلتے وقت کمرے کی بتی جلتی چھوڑ گیا تھا۔ گہرے اندھیرے سے نکل کر بلب کی تیز روشنی نے آنکھیں چندھیادی ہیں۔ اب ہم دونوں کمرے کے سلگتے بلب کے نیچے کھڑے ہیں۔ ہمارے کپڑوں سے پانی پھسل پھسل کر فرش پر بکھر رہا ہے۔ روشنی میں میں نے ایک نظر اسے دیکھا ——— 26-25 برس کا ایک دبلا پتلا سا نوجوان ہے۔ کھلے رنگ کا، تیکھے ناک نقشے والا..... میں جلدی جلدی کپڑے بدلنے لگتا ہوں۔

''اگر چاہیں تو آپ بھی کپڑے بدل لیں۔'' اس سے کہتا ہوں۔

اس نے شاید میری بات نہیں سنی۔ غور سے کمرے کی ایک ایک چیز کو دیکھ رہا ہے۔

کہاں رہتے ہیں آپ؟ میں پھر پوچھتا ہوں۔

''آں.......وہ چونکتا ہے.....کہیں نہیں بس ازلی مسافر سمجھ لیجئے۔ شہر شہر گھومتا پھرتا ہوں۔ ابھی آدھ گھنٹہ پہلے اسٹیشن پر گاڑی رُکی تو قلی سے پوچھا ''کونسا اسٹیشن ہے؟ اس نے کہا: لال دیوار .....نام مجھے اچھا لگا.....بس فوراً گاڑی سے اتر پڑا۔ اب جو اسٹیشن سے نکلا تو ایسا محسوس ہوا جیسے یہ شہر میرا دیکھا ہوا ہے حالانکہ سچ پوچھیے تو میں یہاں پہلی بار آیا ہوں......لیکن حیرت ہے یہاں کی ہر چیز مجھے جانی پہچانی لگی......بازار.........گلیاں اور یہاں تک کہ آپ کا کمرہ بھی.........

میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا ہے۔ اس کی باتیں کتنی عجیب ہیں۔ شاید پاگل ہے ......سوچا پوچھوں——— کہیں آپ پاگل خانے سے تو نہیں آ رہے......لیکن چپ ہو گیا ہوں ......وہ کہہ رہا ہے۔ آپ [illegible] تو لگا ادھر پہلے بھی آ چکا ہوں.......ممکن ہے یہ میرا وہم ہو

—— لیکن ——

اس کی نظر اچانک دیوار پر اٹھ گئی ہے۔

''یہ پینٹنگ آپ نے کہاں سے لی؟ ''

''یہ میرے یہاں آنے سے پہلے ہی ٹنگی تھی۔''

''آپ یہاں کب سے رہتے ہیں؟ ''

مجھے غصّہ آ رہا ہے۔ عجیب احمق آدمی ہے۔ اس قسم کے سوالات کرنے کا اُسے کیا حق ہے۔

''آپ چائے پئیں گے؟ ''میں بات کا رخ بدلتا ہوں۔

''ہاں —— پی لوں گا.........

''لیجیے، پہلے تولیے سے اپنا بھیگا ہوا سر پونچھ ڈالیے ——

اور وہاں آپ اب بھی چاہیں تو کپڑے بدل سکتے ہیں.......

شکریہ کہہ کر وہ تولیے سے اپنا سر پونچھنے لگا ہے۔ اس دوران میں نے کیتلی میں پانی ڈال اسٹوو پر رکھ دیا ہے۔ وہ اب بھی کرسی پر بیٹھا دیوار پر لگی پینٹنگ کو غور سے دیکھ رہا ہے۔

''بھائی صاحب! آپ نے بتایا نہیں، کب سے رہتے ہیں آپ یہاں؟ ''

کتنی سادگی ہے اس کی آواز میں

''یہی کوئی تین چار برس سے''

آپ یقین نہیں کریں گے لیکن یہ سچ ہے کہ بالکل ایسی ہی پینٹنگ میرے ایک دوست نے بنائی تھی..........

اس کی بات سن کر میں ایک دم چونک گیا ہوں۔

''کیا مطلب؟ ''

مجھے لگتا ہے ....وہ لفظ لفظ پر زور دے رہا ہے........ یہ وہی پینٹنگ ہے جو میرے ایک مصور دوست سریشا نند نے میری 22 ویں سالگرہ پر مجھے تحفے میں دی تھی۔

اس کی بات سن کر ایک عجیب سا خوف میرے بدن میں سرایت کرنے لگا ہے۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو دیکھ لیجئے اس پر ایک کونے میں اس کا نام بھی لکھا ہوگا........

میں فوراً آگے بڑھتا ہوں۔ پینٹنگ کے قریب جا کر دیکھتا ہوں۔ ایک کونے میں واقعی انگریزی حروف میں الیس سند لکھا ہے.......

کیتلی میں پانی ابل رہا ہے۔ دودھ اور شکر ملا کر میں چائے بنانے لگتا ہوں، سوچ رہا ہوں آخر یہ کیا قصہ ہے؟ کون ہوسکتا ہے یہ آدمی؟ یقیناً مجھ سے پہلے یہ یہاں رہتا ہوگا اور اب غالباً مجھے خوف زدہ کرنے آیا ہے.......لیکن کیوں ——؟ کس لئے؟

میرا خیال ہے مجھ سے پہلے آپ یہاں رہتے ہوں گے؟

چائے کی پیالی میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے وہ جواب دیتا ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے بھائی صاحب! میں لال دیوار پہلی بار آیا ہوں اور اپنے پورے ہوش وحواس کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں یہاں اس سے پہلے کبھی نہیں آیا —— شاید میرا وہم مجھے ورغلا رہا ہے —— اس شہر سے ذہنی رفاقت، ممکن ہے محض ایک اتفاق ہو —— ممکن ہے ——

اُسے اچانک کچھ یاد آتا ہے۔

"اس پینٹنگ کے پیچھے ایک ڈائری رکھی ہے" کہتے ہوئے وہ اُچھلتا ہے اور پینٹنگ ہٹا کر پیچھے دیکھتا ہے، لیکن وہاں کچھ نہیں ہے۔

وہ کچھ اداس سا ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا ہے اور اب دھیرے دھیرے چائے کے گھونٹ بھر رہا ہے۔

لیکن میری حیرت اور بڑھ گئی ہے۔ خوف کی لہریں میرے سارے بدن میں سانپوں کی طرح رینگ رہی ہیں۔

شاید بارش تھم گئی ہے۔

اس کی بات سن کر میں اپنا ہاتھ کھڑکی سے باہر نکال کر محسوس کرتا ہوں۔ پانی گرنا بند ہو گیا ہے۔

اچھا میں چلتا ہوں۔

یہ کہہ کر وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا ہے۔

میں حیران سا کرسی پر بیٹھا ہوں۔ میں نے اس سے بہت بڑا جھوٹ بولا ہے۔ پینٹنگ کے

پیچھے واقعی ایک ڈائری پڑی تھی۔ ابھی چند روز پہلے جب میں پینٹنگ کا فریم صاف کر رہا تھا تو وہ ایک دم نیچے فرش پر آ گری تھی ـــــ ایک پرانی بوسیدہ اوراق والی ڈائری.........

میں نے اُسے اِدھر اُدھر سے کھولا تھا........ پڑھا کچھ نہیں........ بس کاغذوں میں پھینک دیا ـــــ وہ یقیناً اب بھی کاغذوں کے انبار میں پڑی ہوگی ـــــ میں جلدی جلدی اسے تلاش کرنے لگتا ہوں۔ تمام رسالے ـــــ تمام اخبارات الٹ پلٹ رہا ہوں ـــــ یہیں کہیں ہوگی ـــــ یقیناً ہوگی ـــــ کہاں جا سکتی ہے؟ میں بے صبری سے اسے تلاش کر رہا ہوں ـــــ الماری میں ـــــ چارپائی کے نیچے ـــــ بستر میں ـــــ اور اچانک وہ مجھے مل گئی ـــــ میں نے جھک کر اسے اٹھا لیا ہے۔ اس کے ورق جلدی جلدی الٹ رہا ہوں ـــــ دل جیسے کانپ رہا ہے۔ نہ جانے یہ کیسا خوف ہے جو میرے انگ انگ میں سما گیا ہے۔ پہلے صفحے پر چھوٹے مگر صاف حروف میں یہ چند سطریں درج ہیں۔

"مجھے یقین ہے: میں نے مسیح سے کہیں زیادہ مصائب جھیلے ہیں۔ میں اپنے اندر ایک ایسا درد محسوس کرتا ہوں جو مجھے خوف زدہ کر دیتا ہے۔ میری روح بیمار ہے۔ میرا ذہن نہیں ـــــ ہر وہ شخص جو یہ اوراق پڑھے گا دکھی ہوگا۔

میرا جسم نہیں بلکہ میری روح بیمار ہے ـــــ"

ورق الٹتا ہوں۔ دوسرے صفحے پر نظر گئی ہے تو میرا سر گھومنے لگا ہے۔ دوسرے صفحے پر انتساب ہے جو میرے نام ہے موٹے حروف میں صاف صاف میرا ہی نام لکھا ہے۔

میں دوڑ کر اس آدمی کو آواز دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن اب تک وہ نہ جانے کہاں نکل گیا ہوگا۔

کون تھا وہ؟

مجھے کیسے جانتا ہے؟

میرا اس سے کیا رشتہ ہے؟

کیا رشتہ ہے اس کا مجھ سے؟

کمرے میں چاروں طرف خاموشی ہے۔ کتنا ہولناک سماں ہے۔ لگتا ہے میں اپنے کمرے

میں نہیں بلکہ خود اپنے اندر بیٹھا ہوا ہوں اور لحہ لحہ اپنے ہی وجود کی دیواروں تلے دبتا چلا جا رہا ہوں۔

پہلے آسمان کا زوال

اور پہلے آسمان پر مجھے قتل کر دیا گیا۔
اس روز سورج نہیں نکلا —— چاند بھی نہیں —— تارے بھی نہیں۔ صرف دور دور تک
بادل کھڑے تھے، لمبے گدلے اور گہرے۔ قطار و قطار۔
اور پھر چپ چاپ پانی برسنے لگا
بادل نہیں گرجے
بجلی نہیں چمکی
چاروں طرف اندھیرا تھا —— جنگلوں کا اندھیرا —— گہرا اور نم اور پانی برس رہا تھا۔
لگاتار —— چپ چاپ
شپ شاں........
شپ شاں........
میرے لہو سے دھرتی گلنار ہو گئی تھی درختوں کے پتے بھی سرخ ہو گئے تھے اور شہر کے مکان
کھیت اور دریا سب پر میرے لہو کا رنگ چھا گیا تھا۔
اور پہلے آسمان پر خاموشی تھی۔
ہزاروں لوگ تھے جنھیں میری موت کا غم تھا اور جو آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے

سے پوچھ رہے تھے: کہ اب کیا کرنا ہوگا؟ کوئی نہیں بتاتا تھا کہ اب کیا کرنا ہوگا——

ہزاروں لوگ تھے جو اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے اور سر پر کانٹوں کا تاج رکھے اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے تھے اور پہلے آسمان کے بیچ دائرہ بنا کر کھڑے تھے نہ جہاں مجھے قتل کیا گیا تھا۔

ان کے چہرے زرد تھے اور آنکھیں پھیل کر کانچ ہوگئی تھیں اور وہ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے: اب کیا کرنا ہوگا—— مگر سب خاموش تھے۔

کوئی نہیں جانتا تھا: کہ اب کیا کرنا ہوگا——؟؟

آوازوں کے جنگل پر پانی برس رہا تھا۔

میرا لہو—— جو پانی ہوگیا تھا

اور برس رہا تھا

شپ شاں!

شپ شاں......

اور آوازوں کا جنگل سوکھ رہا تھا۔

پھر دفعتاً آگ لگ گئی۔ پہلے آسمان کے نیچے—— آوازوں کے جنگل میں آگ لگ گئی۔

ہزاروں لوگ تھے جو اپنے اپنے گھروں سے نکل کر باہر آگئے تھے اور میری لاش کے گرد جمع ہوگئے تھے اور ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ اب کیا کرنا ہوگا؟

ہوا سنسنائی——

اور پھر پاگل ہوکر بھاگی

اس کے بال کھل گئے تھے۔ اور وہ میری لاش کے گرد دوڑ رہی تھی۔ اس کے بال کھل گئے تھے—— اس کی چولی ڈھیلی ہوگئی تھی—— اس کا پیٹی کوٹ اتر گیا تھا۔

اور وہ اپنے بھاری کولہوں کے ساتھ پاگل ہوکر دوڑ رہی تھی——

میں نہیں جانتا کہ میرا گناہ کیا تھا—— میں نہیں جانتا کہ میرا قاتل کون ہے اداس تھے اور وہ پوچھ رہے تھے بتاؤ تمہیں کس نے قتل کیا؟؟——

مگر میں خاموش تھا اور پہلے آسمان پر ایک دائرے میں پڑا تھا——
درختوں کے پتے سرخ ہو گئے تھے۔
شہر کے مکان—— کھیت——اور دریا——سب پر میرے لہو کا رنگ چھا گیا تھا——
اور وہ اپنے بھاری کولہوں کے ساتھ پاگل ہو کر دوڑ رہی تھی......وہ فروری کا ایک سرد اور بوجھل دن تھا۔

مدھم نیلی روشنیوں والے ایک کونے میں وہ بیٹھی تھی اور مجھے مسلسل دیکھے جا رہی تھی اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ اور سینہ چولی سے باہر جھانک رہا تھا۔ اس نے میرا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور میری ہتھیلی پر انگلی سے کراس کا نشان بنا دیا۔

میں نے دیکھا: اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ پھر وہ اٹھ کر چلی گئی——
فلور پر رقص کرتی ہوئی اطالوی لڑکی نے اپنی دائیں ٹانگ کو اوپر اٹھا کر ہوا میں ایک دائرہ بنایا
——اور سارا ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔
باہر وہی شور و غل—— وہی آوازیں—— درد میں ڈوبی ہوئی اور موبل آئل میں تحلیل ہوتا ہوا: میں اور وہ

پھر میں نے بازار سے ایک صلیب خریدی اور اسے اپنے کاندھے پر ڈال دیا——
آسماں کالا سیاہ ہو گیا تھا
ہوا دور رہی تھی: روں—— روں—— روں.....
آج چاند نہیں نکلے گا: کوئی زیر لب کہہ رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔
ٹپ.......
ٹپ.......
ٹپ.......
وہ میری نگاہوں کے احاطے سے دور جا چکی تھی——اور میں موبل آئل کے دھوئیں میں تحلیل ہو رہا تھا—— چپ چاپ—— اکیلا——اور لوگ دیکھ رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔
اور پھر پہلے آسمان پر مجھے قتل کر دیا گیا

چاروں طرف اندھیرا تھا—— جنگلوں کا اندھیرا—— گہرا اور نم اور پانی برس رہا
تھا——لگاتار——چپ چاپ
اوراوپر ساتویں آسمان پر
میرا ایک دوست
اپنے بستر پر مردہ پڑا تھا
اور وہ اپنے سیاہ بال کھولے بھاری کولہوں کے ساتھ اس کے لاش کے گرد دوڑ رہی تھی۔

جملوں کی بنیاد

فہرست

-1	جملوں کی بنیاد	870
-2	اندھیرے کے قیدی	880
-3	ایٹی کیٹ	889
-4	بُو	901
-5	کمپلینٹ	912
-6	چور	922
-7	تھکے ہار	932

پریم گوپال مِتّل کے نام

جو میری اور مخمور سعیدی کی آوارگیوں کے تذکرے سُن کر بہت خوش ہوتا ہے

آئینہ نما

زندگی کے اس عظیم ڈرامے میں ہم سب ہمہ وقت اداکاری کرتے ہیں۔ گھر میں، باہر، والدین سے، بیوی بچوں سے، دوستوں سے اور یہاں تک کہ اپنے آپ سے بھی۔ اس کڑوی سچائی کو مان لینے میں کیا حرج ہے کہ ہم جو آپس میں مل جُل کر، لڑ جھگڑ کر اچھی بُری زندگیاں جی رہے ہیں صرف اداکاری کر رہے ہیں۔ ہم اگر ذرا دیر کے لیے بے شرم ہو جائیں یا یوں کہنا مناسب ہوگا کہ اگر ہم تنہائی کے چند لمحوں میں خود میں ذرا سی بھی دلیری پیدا کر لیں تو ہم پر کھلے گا کہ ہم خاصے منجھے ہوئے اداکار ہیں۔ اتنے کہ خود پر بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتے کہ ہم ہمہ وقت اداکاری کرتے ہیں، فطری عمل نہیں کرتے۔

اب سوال یہ اُٹھتا ہے کہ اس عظیم الشان ڈرامے میں مزید کسی ڈرامے کی کیا ضرورت ہے؟ تو میرے پاس اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ ہم لوگ بنیادی طور پر بزدل ہیں۔ آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر بھی ہم خود کو کسی اور شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ یعنی اپنے اصلی خد و خال سے خوف کھاتے ہیں۔

تو طے ہوا کہ زندگی کے اس بے آغاز و بے انجام ڈرامے میں ان یک بابی ڈراموں کا مصرف صرف اتنا ہے کہ ہم اپنے اصلی خد و خال کو ایک نظر دیکھ سکیں۔ طویل ڈرامے کے چند مناظر، میں آئینے کے سامنے لے آیا ہوں۔ اگر ہم خود میں ذرا سی بھی بے شرمی یا من پسند لفظوں میں

جرأت پیدا کرلیں تو کرداروں کے اس جلوس میں ہم خود کو دیکھ بھی سکتے ہیں۔اور اگر چاہیں تو اپنی پہچان بھی کرسکتے ہیں۔

ڈاکٹرز ہوسٹل ،ارون ہوسپٹل نئی دہلی
30/نومبر 1974ء

کمار پاشی

کردار:

گلاب
سمیر
پورنما
اور چار نوجوان

جملوں کی بنیاد

پردہ اٹھتا ہے تو اسٹیج خالی نظر آتی ہے۔ دائیں طرف، دور کونے میں لیمپ پوسٹ ہے، جس میں 40واٹ کا بلب جل رہا ہے۔ لیمپ پوسٹ کے قریب ہی سامنے والی دیوار سے لگا ایک بڑا سا تخت پڑا ہے، جس پر سفید چادر بچھی ہے۔ دائیں اور بائیں ہال کی طرف والے دونوں کونوں میں ایک ایک اسٹول پڑا ہے۔ اسٹیج پر فقط اتنی روشنی ہے کہ ہر چیز بس دکھائی دے رہی ہے۔ دائیں طرف کی دیوار میں چار کھڑکیاں ہیں اور بائیں طرف کی دیوار میں تین، جو سب کی سب کھلی ہوئی ہیں۔ کوئی پردہ نہیں ہے۔ دائیں طرف والی تیسری کھڑکی سے گلاب اسٹیج پر کودتا ہے۔ عمر تقریباً 25، 26 برس اس وقت بنیان اور پتلون پہنے ہے۔ سر کے بال بکھرے ہوئے ہیں گلاب ہاتھ جھاڑ کر دائیں کونے میں پڑے اسٹول پر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کا رخ سامعین کی جانب ہے۔ اچانک بائیں طرف والی پہلی کھڑکی سے سمیر اندر کودتا ہے۔ گلاب آہٹ پا کر اس کی جانب دیکھتا ہے اور کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کا ایک پاؤں اسٹول پر ہے اور دوسرا نیچے سمیر گلاب کا ہم عمر نظر آتا ہے۔ اس نے صرف پتلون پہن رکھی ہے۔ قمیص اس کے بائیں کندھے پر ہے۔ وہ بھی ہاتھ جھاڑ کر بائیں کونے میں پڑے اسٹول پر ایک پاؤں رکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اب دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ اتنے میں سمیر پتلون کی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس کی ڈبیہ نکالتا ہے۔ ایک سگریٹ نکال کر سلگاتا ہے۔ اور آنکھیں میچ کر دو تین لمبے لمبے کش لیتا ہے۔ گلاب اس کی طرف مسلسل دیکھ رہا ہے۔

سمیر: (سگریٹ کا دھواں منہ سے خارج کرتے ہوئے سوالیہ انداز میں گلاب سے مخاطب ہوتا ہے) کیوں؟

گلاب: (اسٹول پر بیٹھتے ہوئے) کچھ ہے؟

سمیر: (کش لے کر) کیا آج پھر زیادہ چڑھا گئے؟

گلاب: نہیں یار —— (وقفہ) ابھی تو مکمل ہوش وحواس میں ہوں۔

سمیر: (سگریٹ کا پیکٹ گلاب کی طرف بڑھاتے ہوئے) سگریٹ؟

گلاب: (نفی میں سر ہلاتے ہوئے) اوں ہوں —— (وقفہ) عیش کرو پیارے!

سمیر: (سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس کی ڈبیہ پتلون کی جیب میں ڈالتا ہے۔ اسٹول پر بیٹھ جاتا ہے اور گلاب سے مخاطب ہوتا ہے) گلّو! ایک خیال آیا ہے ذہن میں۔

گلاب: جملہ ذرا غلط ہو گیا ہے پیارے۔

سمیر: گرامر کے اعتبار سے؟

گلاب: (دائیں ہاتھ کا انگوٹھا اور بڑی انگلی آنکھوں میں دباتے ہوئے) اوں ہوں بنیاد ہی غلط ہے۔

سمیر: کس کی؟

گلاب: جملے کی ——

سمیر: (طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ) اوہ! میں سمجھا تم اپنی بات کر رہے ہو۔

گلاب: (سخت لہجے میں) بات کوئی بھی ہو۔ بنیاد ہمیشہ غلط ہوتی ہے۔

سمیر: کیا کہا —— ؟ ہوتی ہے (ہے پر زور دیتا ہے)

گلاب: (بنیان اتارتے ہوئے) ہاں —— ہے (بنیان اتار کر اسٹول کے قریب رکھ دیتا ہے)

سمیر: کون ہے؟ (وقفہ) تم —— یا —— میں؟

گلاب: ''میں'' کا —— (اونچی آواز میں) سُنا تم نے؟ (وقفہ) ''میں'' کا حدود اربعہ بتاؤ؟

سمیر: (سگریٹ کو اسٹول کی ٹانگ پر رگڑ کر بجھاتے ہوئے) حدود اربعہ —— یا —— وجہ تسمیہ؟

گلاب: (گفتگو کا پہلو بدل کر) آج کا اخبار پڑھا؟

سمیر: ہاں —— وہ بھاگ گئی ہے۔

گلاب: (خوش ہو کر) سچ؟ کس کے ساتھ؟

سمیر: (کھڑے ہوتے ہوئے) میرے ساتھ نہیں۔

گلاب: چلو ـــــ ٹنٹا ختم ہوا ـــــ (وقفہ) اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ ساتویں کھڑکی سے اب کوئی نہیں آئے گا۔

سمیر: (مایوس لہجے میں) کچھ بھی ہو ـــــ تخت تو پھر بھی اپنا نہیں۔

گلاب: (سرگوشی میں) تو کیا ـــــ انقلاب ضروری ہے۔

سمیر: صرف ـــــ گھر میں

گلاب: کس کے گھر میں؟

سمیر: اپنے اپنے۔

گلاب: اس لیے میں نے تو اپنا گھر ہی چھوڑ دیا ہے۔

سمیر: لیکن تمھارے نام کی تختی؟

گلاب: کوئی بھی اتار کر گلے میں لٹکا سکتا ہے۔

سمیر: اور تمہاری پہچان ـــــ؟

گلاب: (غصے میں) پہچان نہیں احمق ـــــ شناخت کہہ ـــــ صحیح لفظ استعمال کرنا سیکھ!

سمیر: سیکھ لوں گا یار ـــــ

گلاب: کس اُلو کے پٹھے سے؟

سمیر: (اونچی آواز میں چیختے ہوئے) اپنے ڈیڈی سے ـــــ سنا تم نے؟ اپنے ڈیڈی سے۔

گلاب: (ہنس کر) یوں کیوں نہیں کہتے ـــــ اپنے ہونے والے ڈیڈی سے۔

سمیر: آخر تمہیں میری ماں کی جوانی سے الرجی کیوں ہے؟

گلاب: ابے الرجی نہیں ـــــ رشک کہہ ـــــ (چڑ کر) سالا کبھی صحیح لفظ استعمال نہیں کرے گا۔

(دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ سمیر پتلون کی جیب سے سگریٹ اور ماچس کی ڈبیں نکالتا ہے۔ سگریٹ سلگاتا ہے اور ایک سگریٹ گلاب کی طرف بڑھاتا ہے۔ گلاب

اٹھ کر سگریٹ لے لیتا ہے۔ سمیر کی جلی ہوئی سگریٹ سے سگریٹ سلگاتا ہے دونوں لمبے لمبے کش لے کر اسٹیج پر ٹہلنے لگتے ہیں)

سمیر: (انگڑائی لیتے ہوئے، گلاب سے مخاطب ہوکر) آؤ ذرا تخت پر سو جائیں۔

گلاب: تو کیا تم اب تک جاگ رہے تھے؟

سمیر: نہیں —— (وقفہ) پیشاب کر رہا تھا۔

گلاب: (بُرا سا منہ بنا کر) چھی چھی —— گندی بات ہے۔ گندی بات!

سمیر: پیشاب کرنا —— یا —— جاگنا -؟

گلاب: دونوں۔

سمیر: تو پھر آؤ —— دونوں مل کر سو جاتے ہیں۔

گلاب: لیکن سو جانے سے ہوگا کیا —— مائی ڈیر سمیر!

سمیر: ممکن وہ کم بخت آ ہی جائے۔

گلاب: وہ ——؟ وہ کون؟

سمیر: وہی —— جس نے وعدہ کیا تھا۔

گلاب: (کچھ سوچتے ہوئے) ارے ہاں! یاد آیا - میرے ڈیڈی نے مجھ سے آج سے ٹھیک دو برس پہلے مجھے 'یو کے' بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔

سمیر: پورا ہوا؟

گلاب: نہیں —— وہ سالا خود ہی چلا گیا۔

سمیر: کہاں؟ 'یو کے'؟

گلاب: نہیں —— کھلی کھڑکی سے ایک رات چپکے سے غائب ہوگیا۔

(دونوں تخت پر بیٹھ جاتے ہیں)

سمیر: آخر لوگ کھڑکیاں کھلی کیوں رکھتے ہیں -؟

گلاب: کیا تم نے اپنی کھڑکی بند کی؟

(اچانک بائیں طرف والی تیسری کھڑکی سے پورنیا اندر کود تی ہے۔ دونوں اس کی طرف

دیکھنے لگتے ہیں۔ عمر لگ بھگ بائیس برس، سفید ساڑی اور جمپر پہنے ہے اور بغیر کسی میک اپ کے ہے۔ اپنے ہاتھ ساڑی سے پونچھتی ہوئی، ہانپتی ہوئی گلاب اور سمیر کی طرف بڑھتی ہے)

پورنیا: تم لوگوں نے کچھ سنا؟

سمیر و گلاب: (دونوں مل کر) کیا؟

پورنیا: انقلاب سچ مچ آ گیا ہے۔

سمیر: کب؟

گلاب: کہاں؟

پورنیا: شہر کی سب دیواروں پر اشتہار لگے ہیں۔ میں ابھی ابھی پڑھ کر آ رہی ہوں۔

گلاب: تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ شہر کی دیواروں سے پوشیدہ بیماریوں کے سارے اشتہار اتار دیے گئے ہیں۔ (قہقہہ)

سمیر: (چڑاتے ہوئے) یوں کیوں نہیں کہتے حرامی! کہ پورنیا بیوہ ہو گئی ہے دیکھتے نہیں (پورنیا کی طرف انگلی گھماتے ہوئے) ذرا لباس دیکھو۔۔۔۔ دیکھو!

گلاب: کاش اگر مجھے معلوم ہوتا پورنیا کہ تم بھری جوانی میں بیوہ ہو جاؤ گی تو یقیناً تم سے میں شادی کرتا ('میں' پر زور دیتا ہے)

پورنیا: لیکن۔۔۔۔ اب میرا کیا ہوگا؟ بتاؤ۔ کیا ہوگا میرا۔۔۔۔؟ (رونے لگتی ہے)

گلاب: (سمیر سے مخاطب ہو کر) جلدی اٹھو۔ ہسپتال چلنا ہے۔

سمیر: (اٹھ کر پورنیا کو دلاسا دیتے ہوئے) غم نہ کر پورنیا۔ ہم ابھی ہسپتال جائیں گے اور وہاں سے لائیں گے۔۔۔۔ دو کلو گرام گھی کا ایک ایک ڈبہ۔

گلاب: اور فی کس 25 روپے۔

سمیر: اس کا مطلب ہے چار کلو گھی اور پچاس روپے۔

گلاب: ابے نہیں۔۔۔۔ کبھی کبھی الجبرے میں بات کیا کر۔۔۔۔ اس کا مطلب ہے چھوٹے پیمانے پر پُرامن پروٹیسٹ.........

پورنیا: کس کے خلاف؟

گلاب: اس شخص کے، جو رسی تڑا کر، کھلی کھڑکی کے راستے سے نو دو گیارہ ہو گیا ہے۔

سمیر: (اطمینان کا سانس لیتے ہوئے) شکر ہے پاک پروردگار کا۔ وہ شخص میں نہیں ہوں۔

گلاب: (قدرے سخت لہجے میں) دیکھو——'میں' کے استعمال سے پہلے 'میں' کا حدود اربعہ اور اس کی وجہ تسمیہ بتاؤ——؟ بتاؤ—— جلدی۔

سمیر: (چڑ کر اونچی آواز میں) کہاناں! اپنے ڈیڈی سے پوچھ کر بتاؤں گا—— اپنے ہونے والے ڈیڈی سے...... سنا——سنا تم نے؟

(اتنے میں دائیں طرف والی پہلی، دوسری اور چوتھی کھڑکیوں سے تین نوجوان نمبر 1، 2 اور 3 کودتے ہیں۔ اس کے فوراً بعد بائیں طرف والی دوسری کھڑکی سے بھی ایک نوجوان نمبر 4 اندر کودتا ہے۔ یہ سب کے سب تخت کے آگے نیچے بیٹھ جاتے ہیں)

نوجوان نمبر 2: ہاں تو صاحب! ہو جائے پھر؟—— دیر کس بات کی ہے؟

سمیر: (حیرت سے) آپ لوگ ہیں کون؟

سارے نوجوان: (مل کر) سامعین

گلاب: تو پھر سنیے——(پورنیما سے مخاطب ہو کر) پورنیما تم بھی بیٹھو۔

(پورنیما سمیر کے قریب تخت پر بیٹھ جاتی ہے)

ہاں تو حضرات! اب میں آپ کو اپنی تازہ ترین غزل کے چند شعر سناتا ہوں۔

سمیر: ارشاد

نوجوان نمبر 3،2: (مل کر) ارشاد عالی!

نوجوان نمبر 4: میں پروٹیسٹ کرتا ہوں۔

سمیر: کس بات کے سلسلے میں ؟

نوجوان نمبر 4: شعر و شاعری نہیں ہوگی!

گلاب: لیکن کیوں ؟

نوجوان نمبر 4: کیا آپ لوگ اخبار نہیں پڑھتے؟ آج کے اخبار میں بہار میں قحط کی خبر چھپی

گلاب: ایسی خبریں تو روز چھپتی ہیں —— بھلا ادب کا قحط سے کیا تعلق ہے؟

سمیر: جی ہاں اس جلسے میں قحط پر کوئی ماتمی ریزولیوشن پاس نہیں ہوگا۔

پورنیا: بھئی! پہلے غزل تو سُن لیجیے۔

نوجوان نمبر 4: نہیں میم صاحب! ریزولیوشن پہلے ہوگا۔

گلاب: (نوجوان سے مخاطب ہوکر) کیا آپ نے اس سلسلے میں اپنی بیوی سے اجازت لی؟

نوجوان نمبر 4: جی ہاں —— وہ تین بچوں کی ماں ہے۔

گلاب: کس کے بچے؟

سمیر: (ہنستے ہوئے) میرے نہیں ہیں گلاب بھائی!

(سب لوگ قہقہہ لگاتے ہیں)

نوجوان نمبر 4: مجھے لگتا ہے —— ہم سب حرامی ہیں۔

گلاب: یہ کس کا جملہ ہے؟

نوجوان نمبر 4: مجھے تو آپ کا لگتا ہے۔

سمیر: (گلاب سے مخاطب ہوکر) تمہاری ایک پرانی نظم کا مصرع ہے یاد کرو۔

گلاب: میں اپنی ہر پرانی چیز کو ڈس اون کر چکا ہوں۔

نوجوان نمبر 2: کیا اپنی ماں کو بھی؟

گلاب: (غصے میں) حرامی! تم حرامی ہو۔

نوجوان نمبر 1: گواہی کون دے گا؟

نوجوان نمبر 4: میں —— میں دوں گا۔

گلاب: لیکن 'میں' کا حدود اربعہ؟

سمیر: اور وجہ تسمیہ بھی!

گلاب: اچھا سب سے پہلے مجھے یہ بتایا جائے کہ جغرافیہ کس نے لکھا تھا؟

پورنیا: میں بتاتی ہوں —— (ہاتھ اٹھا کر) جغرافیہ اس نے لکھا تھا جو ساتویں کھڑکی سے

اندر آیا ہے۔

سمیر: کون آیا ہے ساتویں کھڑکی سے؟ جلدی بتاؤ۔ کون آیا ہے؟

گلاب: احمقو! پہلے یہ تو پتہ لگاؤ کہ ساتویں کھڑکی ہے کون سی؟

نوجوان نمبر 2: میرا خیال ہے کوئی بھی نہیں۔

سمیر: کیسے ہوسکتا ہے؟ ہم یہاں سات ہیں اور کھڑکیاں بھی سات ہیں —— پھر یہ معلوم کرنا کیا مشکل ہے۔ کہ ساتویں کھڑکی کون سی ہے۔

گلاب: اچھا تو پہلے یہ بتاؤ کہ ہم میں سے ساتواں کون ہے؟

سمیر: بھائی گلاب! کم از کم میں نہیں ہوں۔

پورنیما: میں بھی نہیں ——

نوجوان نمبر 2: میں بھی نہیں ——

نوجوان نمبر 1: میں بھی ——

نوجوان نمبر 4: میں بھی ——

نوجوان نمبر 3: اور میں بھی ——

گلاب: تو پھر ساتواں اب تک آیا کیوں نہیں؟ اس کو بلاؤ —— فوراً۔

سمیر: شاید وہ انقلاب کی تلاش میں کہیں دور نکل گیا ہے (قہقہہ)

پورنیما: کہاں؟

سمیر: شاید —— اپنے گھر!

گلاب: تو ثابت ہوا کہ جغرافیہ پھر سے لکھا جائے گا۔ کیوں حضرات؟

نوجوان نمبر 3: شاعر صاحب! معلوم ہو کہ جغرافیہ لکھا نہیں جاتا!

گلاب: تو پھر اس کا نام بتاؤ جو لکھا جاتا ہے؟

پورنیما: بہت اچھا سوال ہے۔ شاید اس سے ساتویں کا اتہ پتہ ملے۔

گلاب: پورنیما —— ایک بات یاد رکھو۔ جملہ ہمیشہ صحیح بولا کرو۔ سمجھیں؟

سمیر: صحیح کون ہے؟

پورنیما: شاید ہم——سب غلط ہیں۔

نوجوان نمبر4: شاید کیوں؟——بلکہ ہیں——یقیناً ہیں۔

گلاب: تو پھر آؤ——ماتم کریں۔

سمیر: کس کا؟

گلاب: اپنے اپنے غلط ہونے کا——

نوجوان نمبر4: اپنے اپنے ہونے کا——

نوجوان نمبر3: نہ ہونے کا——

نوجوان نمبر2: تو پھر اٹھو——ماتم کرو——

سب مل کر: ہاں——ماتم کرو——ماتم کرو——ماتم کرو

(سب اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ روشنی دھیرے دھیرے کم ہوتی جاتی ہے۔ یہ الفاظ پردہ گرنے تک بار بار گونجتے ہیں:

ہم سب ماتم کرتے ہیں——

ہم سب ماتم کرتے ہیں——

اپنے اپنے غلط ہونے کا——

ہونے کا——

نہ ہونے کا——

(پردہ)

کردار:

سونو
نندی
نیتا

اندھیرے کے قیدی

سونو کے مکان کا باہری حصہ۔ سامنے دہلیز ہے۔ دو چھوٹی چھوٹی سیڑھیاں ہیں اور ان کے اوپر نو انچ اندر کی طرف لگا دروازہ جس کے دونوں پٹ کھلے ہیں۔ اندر بالکل اندھیرا ہے۔ صرف باہر کی بہت ہی ہلکی روشنی کھلے دروازوں کی حدوں تک تھوڑی دور اندر فرش پر بکھری ہوئی ہے۔ دائیں طرف ایک چھوٹی سی کھڑکی ہے جس میں سریئے لگے ہیں۔ کھڑکی کے عین اوپر روشندان ہے جس کا کانچ ٹوٹا ہوا ہے۔ بائیں دیوار پر بھی دروازے سے اتنی ہی دوری اور اونچائی پر اسی طرح کا روشن دان ہے۔ جس میں ایک پھٹی ہوئی پتنگ اٹکی ہے —— دائیں بائیں دیواروں پر طرح طرح کے ادھ پھٹے، ثابت پوسٹر لگے ہیں۔ بائیں طرف ذرا نیچے دیوناگری حروف میں لکھا ہے۔ یہاں صرف گدھے پیشاب کرتے ہیں۔ سونو اپنے گھٹنوں میں گالوں تک چہرہ دبائے چوکھٹ سے پیٹھ ٹکائے بیٹھا ہے۔ اس کے ہاتھ ٹانگوں کے گرد بندھے ہیں۔ آنکھیں زمین پر ہیں جنھیں وہ بار بار کھولتا ہے، بند کرتا ہے۔ وہ گہرے اداس موڈ میں ہے۔ دائیں طرف سے نندی داخل ہوتا ہے اور سونو کے قریب جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ پھر دروازے کے اندر جھانکتا ہے۔

نندی: (دھیرے سے) سونو.........سونو.........

(سونو سر اٹھا کر نندی کو دیکھتا ہے اور ٹھوڑی گھٹنوں پر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیتا ہے)

نندی: کیا بات ہے سونو.........سر شام.........اس.........طرح.........دہلیز پر.........

(سونو پھر سر اٹھاتا ہے اور گالوں تک اپنا چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیتا ہے —— اس کی آنکھیں کھلی ہیں)

نندی: کیا وہ مر گیا ہے؟

سونو: (اسی حالت میں) نہیں.......وہ خبیث (وقفہ......پھر غصے میں) ابھی تک .... زندہ ہے (وقفہ) مجھے حیرت ہے......کہ..........

نندی: کہ وہ اب تک مرا کیوں نہیں......یہی نا........ ؟

سونو: نہیں........بلکہ یہ (وقفہ) کہ میں اس کی موت کا انتظار کیوں کر رہا ہوں......

نندی: میرا خیال ہے سونو........کہ وہ مر چکا ہے..........

سونو: نہیں نندی........نہیں..........وہ بڑا ڈھیٹ ہے.......آسانی سے نہیں مرے گا ....شاید وہ........شاید وہ جان گیا ہے........کہ میں اس کا کال ہوں..........

(وقفہ)

نندی: کیا تم بھوت پریت کو مانتے ہو؟

سونو: (تھوڑے وقفے کے بعد) معلوم نہیں.........

نندی: مجھے یقین ہے کہ بڈھا مر گیا ہے.......اور اب اندر وہ نہیں.......اس کا بھوت پڑا ہے.........

سونو: جو کوئی بھی ہے.......مگر زندہ ہے.......اور مجھے اس کی موت کا انتظار ہے....... (وقفہ) میرا ایک کام کرو.........

نندی: کیا..........؟

سونو: تم چپکے سے اندر جاؤ........وہ اس وقت دوسرے کمرے میں چارپائی پر پڑا ہے...... (وقفہ) بس چپکے سے جاؤ......اور......اس کا گلا دبا دو.......

نندی: لیکن.......یہ سب.......شاید.........یہ سب غیر فطری ہوگا........

سونو: (سر اٹھا کر) کیا تمہیں خدا کے وجود پر یقین ہے؟

نندی: کبھی کبھی.......میرا اپنے وجود پر سے بھی یقین اٹھنے لگتا ہے........

سونو: (سختی سے) میں خدا کی بات کر رہا ہوں۔

نندی: وہ اگر ہے.......تو زندہ ہے.......اور سب دیکھتا ہے.........

سونو: تم.......(نفرت سے) جانور ہو.........

نندی: کاش ایسا ہوتا.......مگر شاید میں......انسان ہوں............

(وقفہ)

سونو: تم میرے دوست ہو، مجھے اس کرب سے باہر نکالو.........ایسا لگتا ہے کوئی پہاڑ ہے جو میرے کاندھوں پر رکھا ہے اور میں لحہ لحہ زمین میں دھنس رہا ہوں (وقفہ) سانس لیتے ہوئے دم گھٹتا ہے.......مٹی میرے نتھنوں میں کھنچی آ رہی ہے.......میں مر جاؤں گا نندی......مجھے مرنے سے بچالو.......بس تھوڑی دیر کے لیے اندر چلے جاؤ.......اور چپکے سے اس کا گلا دبا دو.......اسے معلوم بھی نہ ہوگا.......خدا اگر زندہ ہے.......دیکھ رہا ہے تو.......خوش ہوگا...........

نندی: وہ تمہارا باپ ہے.......اسے مار ڈالنے کا حق تمہیں ہے........

سونو: لیکن وہ میرے قدموں کی آہٹ تک جان لیتا ہے......تم جاؤ گے تو اسے معلوم بھی نہیں ہوگا.........

نندی: پھر بھی.......یہ سراسر قتل ہے........

سونو: نہیں........بلکہ میری اور نیتا کی زندگی ہے......کیا تم ہمیں جیون دان نہیں دو گے؟ (نندی کا ہاتھ پکڑ کر) بتاؤ.........

نندی: میں خدا جیسے بیکار کام نہیں کرتا...........

(وقفہ)

سونو: تم نہیں جانتے نندی.......وہ کیسا مردار ہے........(وقفہ) ہر رات وہ میری ماں کو بیچ دیتا تھا.......کیا حسین تھی میری ماں.......پھول کی طرح نازک.......مہکتی ہوئی.......لیکن چند ہی دنوں میں اس کے جسم کی خوشبو سارے شہر میں بٹ گئی۔ اور وہ سوکھے جالی دار پتے کی طرح ہوا میں پرزہ پرزہ ہوگئی.........(وقفہ) تم نے چند برس پہلے ایک ننگی عورت کو اس گلی میں چیختے دیکھا ہوگا......وہ میری ماں تھی......سچ کہتا ہوں نندی.......جی چاہتا ہے.......گھر گھر جاؤں....... اسے سمیٹوں اور یکجا کر کے پھر سے زندہ کر دوں.......کاش! میں.......خدا ہوتا.........

نندی: اگر ہم سب خدا ہوتے تو کیا ہوتا.........

سونو: یہ دنیا بڑی خوبصورت ہوتی (وقفہ) خوب صورت اور اجلی.......میری ماں کی طرح ....

نندی: (پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ) نہیں....... بلکہ یہ برہمانڈ ایک کھولتا ہوا مہیب سمندر ہوتا.......اور ہم سارے خدا اس کے قہر کی نذر ہو جاتے......

سونو: (دروازے کی طرف کان لگا کر) نندی ڈیر......سیاہ سمندر........شاید سو گیا ہے.... کوئی آواز نہیں......بس یہی وقت ہے.......جاؤ...... چپکے سے اندر چلے جاؤ اور اس مردار کی گردن کے منکے پر اپنا انگوٹھا رکھ دو....... میں سچ کہتا ہوں.......وہ چیخ بھی نہ سکے گا......بس چپکے سے مر جائے گا۔

نندی: ٹھیک ہے.......اگر خدا ہے اور دیکھتا ہے......تو سارا پاپ تمہاری گردن پر.......

سونو: ہاں.......اگر خدا ہے اور دیکھتا ہے......تو سارا پاپ میری گردن پر۔(زمین پر پھیلے ہوئے اپنے اور نندی کے سایوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ہمارے سائے گواہ ہیں.......

(نندی دلہیز کی سیڑھیاں چڑھتا ہے اور دروازے کے اندر داخل ہو جاتا ہے.......سونو اسے جاتے ہوئے دیکھتا ہے.......نندی کے قدموں کی آہٹ دور ہوتی جاتی ہے پھر ایک دم خاموشی.......سونو کا رخ اب سامعین کی جانب ہے)

سونو: نیتا جب اس کی موت کی خبر سنے گی تو کتنی خوش ہوگی.......وہ کتنی اچھی ہے اور کتنی نیک ......ہم مل کر اس خبیث کی چتا پر ایک ایسا گھر بنائیں گے.........جو شاندار ہوگا میں نیتا سے کہوں گا: آؤ.......مل کر اپنی منتشر ماں کو سمیٹیں......اسے پھر سے پیدا کریں........

(اچانک دروازے کے اندر سے بہت سی چمگادڑوں کی چیخیں گونجتی ہیں......سونو ڈر کر اندر جھانکتا ہے۔عین اس وقت نندی بھاگتا ہوا، ہانپتا ہوا اندر سے آتا ہے........ چہرہ پسینے سے تر ......خوفزدہ.......)

سونو: (نندی کو تھام کر) کیا وہ مر گیا؟

نندی: (ہانپتے ہوئے) نہیں.......وہ زندہ ہے شاید اسے شک ہو گیا ہے.......میں جب

اندر گیا تو وہ چادر منہ پر ڈالے تھا....... جیسے ہی میں نے اپنے ہاتھ آگے بڑھائے تو اس نے چادر الٹ دی...... اور پوچھا: کون ہے؟...... کیسی دل ہلانے والی آواز تھی اس کی...... (وقفہ) وہ بہت بڑے عذاب میں ہے....... وہ زندہ ہے لیکن مردوں سے بدتر........ وہ جاگ رہا ہے لیکن سویا ہوا لگتا ہے........ وہ گاڑھی پر تعفن نیند میں لتھڑا ہوا ہے۔ لیکن لگتا ہے جاگ رہا ہے...... خوفناک اندھیروں میں کسی مکروہ اجگر کی طرح....... اس کی آنکھوں میں ایک عجیب ساز ہر ہے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اپنا سارا زہر خارج کر دینا چاہتا ہے.........

(وقفہ)

سوتو: تم بزدل ہو۔

نندی: ہاں میں بزدل ہوں...... اس کی آنکھیں اب بھی میرے جسم میں سوراخ کر رہی ہیں لگتا ہے جیسے میں اندر ہی اندر سے ادھڑ رہا ہوں...... (وقفہ) تم تو جانتے ہی ہو، نیتا مجھے کس قدر چاہتی ہے، اسے پا کر میں نے سوچا تھا مجھے پتنی کے روپ میں اپنی خوب صورت اور نیک دل ماں مل گئی...... لیکن میرا خبیث باپ اس کے جسم کی خوشبو کو بھی گھر گھر بانٹ دینا چاہتا ہے..... سنو، ..... (وقفہ) ایک رات اس نے ہمیشہ کی طرح بہت زیادہ پی لی تھی اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا.... کوئی شوقین رئیس....... میں اتفاق سے کہیں باہر تھا جب گھر میں آیا تو دیکھا نیتا رو رہی تھی....... اس کا بلاؤز پھٹا ہوا تھا........ اس کے بال کھلے ہوئے تھے........ مجھے دیکھتے ہی وہ چیخ اٹھی..... آگے بڑھ کر مجھے نوچنے لگی....... (ہانپتے ہوئے نیتا کے لہجے میں) تم میرے پتی نہیں ہو...... ناں .... ناں....... ناں...... تم میرے پتی نہیں........ جاؤ...... چلے جاؤ یہاں سے ...... لیکن وہ خود چلی گئی...... اس گھر کو چھوڑ کر........ مجھے چھوڑ کر........ اپنی ماں کے پاس...... (وقفہ) کاش! یہ حرام خور مر جائے تو میں اسے جا کر لے آؤں...... اس دھوپ کے گالے کو مٹھی میں چھپا لاؤں اور اپنے گھر کے کسی طاق میں سجا دوں....... اجالا کر دوں...... (نندی کا بازو پکڑ کر) نندی..... تم ایک بار پھر کوشش کر دیکھو...... میرا خیال ہے (اندر جھانکتے ہوئے) بڈھا سو گیا ہے (دھیمی آواز میں) بس دبے پاؤں جاؤ..... اور اس کی گردن کے منکے پر..........

نندی: وہ بڑا شیطان ہے....... ممکن ہے سونے کا بہانہ کر رہا ہو....... میں نے ہاتھ بڑھایا

تو ممکن ہے......ممکن ہے جگ جائے........

(اچانک اندر سے چمگادڑ کے چیخنے کی آواز آتی ہے)

دیکھا......شاید اسی کی آواز ہے.......اسی شیطان کی.......وہ یقیناً جاگ رہا ہے.....اور طیش میں ہے.......اپنا سارا زہر کہیں خارج کرنا چاہتا ہے۔

(اتنے میں نیتا بائیں طرف سے داخل ہوتی ہے)

نیتا: (سونو سے مخاطب ہو کر) شاید اب میں کھلی فضا میں سانس لے سکتی ہوں۔

سونو: غلاموں کے گھر میں کیا یہ ممکن ہے؟ نندی......کیوں؟

نندی: تمہیں آزاد ہونے میں وقت لگے گا..........

نیتا: کیا وہ مر گیا......؟

سونو: تمہیں کیسے معلوم ہوا........؟

نیتا: میں نے کل خواب میں دیکھا وہ مر گیا ہے.......میں سمندر کے لانبے ساحل پر دوڑ رہی ہوں......سمندر کی ریت میرے پاؤں کے نیچے ہے اور نم دھوپ میرے سر پر اور میں دوڑ رہی ہوں......سمندر کے لانبے ساحل پر........

نندی: وہ زندہ ہے.......

نیتا: اس کا مرنا....... (وقفہ) ضروری ہے.......میرے پیٹ میں بچہ ہے.......میں نہیں چاہتی (سونو سے مخاطب ہو کر) تمہارے باپ کا سایہ اس پر پڑے.........

سونو: نندی......تم ایک بار پھر کوشش کرو.......شاید ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں.......

نندی: ٹھیک ہے.......میں جاتا ہوں......تم میرے لیے دعا کرنا.........

(دروازے کے اندر داخل ہو جاتا ہے)

سونو: ہم دونوں مل کر دعا کریں گے......تمہارے لیے......اس آنے والے کی خاطر.....

نیتا: اس آنے والے کی خاطر........جو ہمارا ہے.......دن کی طرح اجلا اور روشن.......

(وقفہ)

سونو: وہ جو آنے والا ہے.......کیا ہم اسے دیکھ سکیں گے؟ نیتا......تمھیں یقین ہے؟

نیتا: سمندر پر بہنے والے ہوا کو کیسے مٹھی میں بھر سکتے ہیں؟ (وقفہ) شاید ہم اداسی کی اس موج کے ساتھ بندھ گئے ہیں جس کا کچھ ٹھیک نہیں.........

سونو: شاید یہ وہ لمحہ ہے، جس میں ہمیں ڈوب جانا ہے.........بغیر آواز کیے.......چپ چاپ (وقفہ) کسی کو خبر لگے بغیر.........

نیتا: تو پھر کیوں نہ ہم ماتم کریں.......چیخوں کے کہرام میں.........

سونو: تب بھی کوئی نہ آئے گا.........یہ شہر نہیں (اونچی آواز میں) ایک بہت بڑا قبرستان ہے ......جہاں غلیظ چوہے رینگتے ہیں.........

نیتا: تو پھر کیوں نہ.........ہم مر جائیں؟

سونو: کیا ہم زندہ ہیں؟

نیتا: مجھے اتنا معلوم ہے کہ میں ایسا چاہتی ہوں۔

سونو: وہ .... جو اندر ہے ......زندہ ہے.......سوفی صد زندہ ہے.......کیا تم (نیتا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر) اتنا کر سکتی ہو؟

نیتا: میں صرف.......کوشش کر سکتی ہوں.........

سونو: کرنے کی؟

نیتا: گر جانے سے بچنے کی.........

سونو: (سر آسمان کی طرف اُٹھا کر، اونچی آواز میں) اس عظیم الشان قبرستان میں سب کی طرح تمھیں بھی نیچے اترنا ہوگا.........بغیر آواز کیے....... (سرگوشی میں) چپ چاپ.......ایک لاش کی طرح......... یہاں کے لوگوں کی یہی رسم ہے.........اس پرانے عالیشان قبرستان کی یہی روایت ہے۔

نیتا: تو پھر.........پھر کیوں نہ ہم مر جائیں۔

سونو: شاید ہم یہ نہ کر سکیں.......ہم.......جو پرانے بزدل ہیں........ پرانے بزدل.........

(اچانک اندر سے ایک ساتھ کئی چمگادڑ چیخنے لگتے ہیں.......پھر کچھ چیزوں کے ٹوٹنے کی

..... کسی کے گرنے کی اور سسکنے کی آوازیں آتی ہیں......... سونو اور نیتا حیرانی اور گھبراہٹ میں دروازے کے اندر جھانکتے ہیں......... نندی خوفزدہ سا پسینہ پسینہ باہر نکلتا ہے)

سونو: (آگے بڑھ کر اسے تھامتے ہوئے) کیوں......کیا ہوا؟

نندی: ذرا دم لینے دو......... بتاتا ہوں (ہانپتا ہے) سب بتاتا ہوں........ (وقفہ) اندھیرا بہت گہرا ہے...... آنکھیں جلا دینے والا گہرا اندھیرا........ اور وہ ہر جگہ موجود ہے...... اسے کیسے مار ڈالوں...... کیسے؟ وہ ہر دیوار میں ہے......... ہر چیز میں ہے........ وہ مرا ہوا بھی ہے اور زندہ بھی .... دراصل وہ گہرے عذاب میں ہے......... وہ ٹوٹ پھوٹ کر شاید........ گھر کی ایک ایک اینٹ میں سما گیا ہے........ ایک ایک اینٹ میں اس کی مردہ آنکھیں کھب گئی ہیں....... (اونچی آواز میں) اس گھر کی ایک ایک اینٹ کو گرنا ہوگا....... ایک ایک اینٹ کو جلا دینا ہوگا........

سونو: ہم انتظار کریں گے.........

نیتا: گھر کی ایک ایک اینٹ کر کے گرنے کا........

سونو: گھر کی ایک ایک چیز کو جلنے کا..........

تینوں مل کر: ہم انتظار کریں گے......... ان گہرے، آنکھیں جلا دینے والے اندھیروں میں....... اس کے مرنے کا....... اس کے مرنے کا........

(نیتا سونو کے کندھے پر سر رکھ کر سسکنے لگتی ہے)

(پردہ)

کردار:

نروان
رکتیما
سہائے
منوہر
اگنی ہوتری
سدھاکرن
ست پتی

ایڈ کیٹ

ڈرائنگ کم بیڈروم-معمولی فرنیچر-بائیں جانب دروازہ جس پر چھینٹ کا پردہ پڑا ہے۔ دائیں طرف دیوار سے لگا ہوا لکڑی کا پلنگ، جس پر گلابی رنگ کی چادر بچھی ہے۔ مختلف رنگوں والے کور میں لپٹے دو تکیے جو ایک دوسرے کے اوپر پڑے ہیں۔ سامنے دائیں طرف بھی دروازہ، اس پر بھی چھینٹ کا پردہ پڑا ہے۔ دیوار سے لگا ہوا صوفہ ہے جس کے آگے میز رکھی ہے۔ دائیں بائیں صوفے کی کرسیاں۔ میز پر گلدان اور شیشے کے چھ گلاس اور پلاسٹک کا ایک جگ پڑا ہے۔ صوفے کے پاس ہی ایک چھوٹی سی میز پر ایک پرانا سا ریڈیو رکھا ہوا ہے اور اس پر ٹائم پیس جس میں چھ بجے ہیں۔ پردہ جب اُٹھتا ہے، اس وقت کمرے میں کوئی نہیں ہوتا—— اچانک بائیں دروازے سے پردہ ہٹا کر نروان کمرے میں داخل ہوتا ہے- اور خوش خوش سا پورے کمرے کا ایک نظر جائزہ لیتا ہے۔

نروان: (اونچی آواز میں) رکتیما...... ارے بھئی کہاں ہو؟

(اسٹیج کے پیچھے سے رکتیما کی آواز آتی ہے)

رکتیما: آتی ہوں....... (پھر سامنے دائیں طرف کے دروازے کا پردہ ہٹا کر رکتیما کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ دایاں ہاتھ بیسن سے سنا ہے) آ گئے تم؟

نروان: بھئی رکتیما! تم نے تو کمال ہی کر دیا۔ خوب سیٹنگ کی ہے کمرے کی—— اور ہاں—— کباب بن گئے؟

رکتیما: ہاں ہاں سب کچھ بن گیا ہے۔ کباب، تِلّے، مچھلی اور اب مرچ کے پکوڑے تل رہی

ہوں۔

نروان: زندہ باد رکتیما۔ زندہ باد! آج تو دعوت کا لطف آجائے گا۔ کیا یاد کریں گے اپنے دوست احباب بھی (رکتیما کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر) اپنی تو بس ایک ہی دعا ہے کہ خدا سب کو تم جیسی بیوی دے۔

رکتیما: (پیچھے ہٹتے ہوئے) چھی جو بات بھی کہو گے الٹی۔ (اچانک سنجیدہ ہو کر) ارے! تم سے ایک بات کہنا تو بھول ہی گئی۔

نروان: (حیرت سے) کیا۔؟

رکتیما! وہ اپنے اگنی ہوتری ہیں ناں؟

نروان: ہاں ہاں —— کیا دے گیا بوتلیں؟

رکتیما: بوتلیں —— بوتلیں کیسی؟

نروان: بھئی رم کی دو بوتلیں لانے کو نہیں کہا تھا اس سے، ملٹری کینٹین سے؟

رکتیما: بتا تو رہی ہوں۔

نروان: کہاں ہیں بوتلیں؟

رکتیما: سنتے تو ہو نہیں —— تمھیں تو بس شراب کی پڑی ہے۔ (ہولے سے) اگنی ہوتری کی ماں کا دیہانت ہو گیا ہے۔

نروان: کب؟

رکتیما: بس گھنٹہ بھر پہلے

نروان: ہوں........ چلو اچھا ہوا —— چھوٹ گئی بچاری مصیبت سے ...... صدیوں سے بیمار چل رہی تھی........ اگنی ہوتری کا تو پنڈ چھوٹا........ خاصا پیسہ برباد کیا ہے اس نے ماں کی بیماری پر...... لیکن اب بوتلیں کیسے آئیں گی؟

رکتیما: تم بھی ذرا اس کے ہاں پُرسہ دے آؤ۔

نروان: بھئی تم تو ہو آئی ہو ناں؟

رکتیما: میں تو گئی تھی مگر تمھارا جانا بہت ضروری ہے........ دوست تو آخر تمھارا ہی ہے؟

نروان: لیکن میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اب بوتلیں کیسے آئیں گی؟ میرے خیال میں آج کی
رات میں اگنی ہوتری تو آنے سے رہا۔

رکتیما: وہ کیسے آسکتا ہے بھلا؟

نروان: آنے کو کیا ہے؟ آخر ساٹھ برس کی بڑھیا ہی تو مری ہے۔

رکتیما: کچھ بھی ہو ـــــ پھر بھی اس کی ماں تھی۔

نروان: لیکن اپنا تو کباڑہ کر گئی (جھنجھلاہٹ میں) اس سسری کو بھی آج ہی مرنا تھا........
اب شراب کہاں سے آئے گی؟

رکتیما: میری مانو......تو ایک کام کرو........آج شراب وراب کا پروگرام کینسل کر دو۔

نروان: کینسل کر دوں! دماغ خراب ہے تمھارا؟ شریمتی جی سب لوگ بس اب آنے ہی
والے ہیں.......دیکھو (ریڈیو پر رکھی ٹائم پیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) چھ بج چکے ہیں۔
سب لوگ بس آئے کہ آئے؟

رکتیما: میں تو کہوں گی آج سب کی سنیکس وغیرہ کھلا کر رخصت کر دو...... پڑوس میں موت
ہو اور یہاں شراب اڑے۔ اچھا لگے گا کیا؟ محلے میں کسی کو معلوم ہو گیا تو کیا سوچے گا.......اور پھر
اگنی ہوتری تو تمھارا خاص دوست ہے۔

نروان: ارے۔ ہر دوست خاص ہوتا ہے......پھر موت محلے میں ہو اور ماتم یہاں.......
شراب تو شریمتی جی آج ضرور چلے گی......لوگ تمھارے سنیکس کھانے نہیں....... پینے آرہے
ہیں۔

رکتیما: لیکن جب شراب ہی نہیں تو پیو گے کیا؟

نروان: یہ مسئلہ تو اب تم ہی حل کر سکتی ہو؟

رکتیما: دیکھو جی......روپے پیسے کی بات نہ کرنا.......گھر میں صرف دس روپے پڑے ہیں
......اور ابھی پہلی تاریخ میں تین دن باقی ہیں۔

نروان: ارے بھئی پیسے کون مانگ رہا ہے تم سے؟

رکتیما: تو پھر؟

نروان: تم ذرا اگنی ہوتری کے ہاں چلی جاؤ..... میرے خیال میں رم اس نے ضرور منگا رکھی ہوگی...... وہ لیتی آؤ؟

رکتیما: کیا بچوں جیسی باتیں کرتے ہو؟ ان کے گھر کہرام مچا ہے اور میں جاؤں شراب مانگنے اُن سے؟

نروان: ارے بھئی اگنی ہوتری کو ایک طرف بلا کر چپکے سے کہہ دینا؟

رکتیما: کیا کہہ دوں؟ یہی کہ تمھاری ماں مرگئی ہے۔ اور ہمارے ہاں شراب اڑے گی؟

نروان: (غصے میں) بھئی یوں تھوڑے ہی کہنا ہے۔ بس کسی نہ کسی طرح گھما پھرا کر کہہ دینا ....

رکتیما: جی نہیں........ یہ مجھ سے نہیں ہوگا........ اگر ایسا ہی ہے تو خود ہی مانگ لاؤ جا کر........

نروان: بھلا اس کہرام میں میں کیسے جاؤں؟ محلے بھر کی عورتیں جمع ہوں گی........

رکتیما: اسی لیے تو کہتی ہوں...... شراب کا پروگرام کینسل کر دو۔ پھر کبھی بلا لینا دوستوں کو ....

(اچانک بائیں دروازے پر دستک ہوتی ہے)

نروان: لو...... آ گئے سب لوگ....... (نروان دروازے کی طرف بڑھتا ہے اور رکتیما پردہ ہٹا کر اندر چلی جاتی ہے....... نروان بائیں دروازے کا پردہ ہٹاتا ہے۔ سہائے اندر داخل ہوتا ہے)

نروان: (حیرت سے) ارے تم؟

سہائے: کیوں؟ میرے آنے سے تکلیف ہوئی ہے.......؟ (ٹیبل پر پڑے گلاسوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ کس کی دعوت ہونے جا رہی ہے؟

نروان: (ہڑبڑا کر) بس یونہی .... اچانک پروگرام بن گیا....... (صوفے کی طرف اشارہ کر کے) بیٹھو........

سہائے: اگر دارو وارو پلاؤ تو بیٹھ جاتے ہیں۔

نروان: پہلے بیٹھو تو........

سہائے: (بیٹھتے ہوئے) لو.......بیٹھ گئے؟ کون کون آ رہا ہے؟

نروان: ایسے ہی دفتر کے لوگ ہیں......منوہر، سدھا کرن، ست پتی۔

سہائے: ہوں......اور وہ تمھارا لنگوٹیا؟

نروان: کون؟

سہائے: ارے وہی......کیا نام ہے اس کا؟ (دماغ پر زور دیتے ہوئے)
بھئی وہ جو پینے کے بعد خوب روتا ہے ـــــ دھاڑیں مار مار کر........

نروان: اگنی ہوتری ؟

سہائے: ہاں..... ہاں وہی........

نروان: ارے اس کا ذکر نہ کرو یار.......سارا پروگرام ہی غارت کر دیا ہے۔
پٹھے نے.........

سہائے: کیوں......کیسے؟

نروان: میں نے رم کی دو بوتلیں اس کے ذمے لگائی تھیں........مگر ابھی ابھی اس کی ماں چل بسی ہے......اب بھلا کیا آئے گا وہ......؟

سہائے: وہ نہیں آتا تو نہ آئے......مگر بوتلیں تو بھجوا دے؟

نروان: بھئی اب ماتم والے گھر میں لینے کون جائے......؟ پورے محلے کی عورتیں جمع ہوں گی.........

سہائے: بھابی سے کہو لے آئے جا کر ـــــ!

نروان: بھیا! اگر وہ جاتی تو پھر رونا ہی کیا تھا........اب تو تم ہی کچھ کر سکتے ہو؟

سہائے: میں......؟

نروان: ہاں........کسی کے ہاں سے رم کی ایک بوتل کا انتظام کرا دو۔

سہائے: دیکھو........کوشش کرتا ہوں۔

نروان: کوشش نہیں......یہ کام تو تمھیں کرنا ہی ہے۔ پلیز.....جلدی جاؤ۔

سہائے: تو نکالو پیسے.......؟

نروان: (اپنی جیبیں ٹٹولتے ہوئے) یار پیسے میرے پاس تو ہیں نہیں........
تمھاری بھابی سے اس وقت مانگوں گا تو ہلّہ کرے گی......ایک آدھ روز میں دے دوں گا تمھیں........

سہائے: اچھا تو چلتا ہوں۔

(اُٹھتا ہے اور پردہ ہٹا کر دروازے سے باہر نکلنے لگتا ہے)

نروان: یار.........انتظام کر کے ہی آنا.......اور ذرا جلدی.......پلیز.......عزت کا سوال ہے اپنی...........

سہائے: (باہر نکلتے ہوئے) بھئی جا تو رہا ہوں.....آگے اللہ مالک ہے.......

(نروان کمرے میں تنہا ٹہلتے ہوئے اپنے آپ سے مخاطب ہے)

نروان: سب لوگ اب آتے ہی ہوں گے۔ نہ جانے سہائے کب لوٹے.......ذرا سی دیر ہوئی تو منوہر آسمان سر پر اٹھالے گا۔ ایک نمبر کا حرام زادہ ہے اسے تو اس پروگرام میں بلانا ہی نہیں تھا۔ خیر......اب تو پھنس ہی گئے۔ لاج رہ جائے کسی طرح.......آئندہ میرے باپ کی توبہ......

(اچانک رکتیما کمرے میں داخل ہوتی ہے)

رکتیما: آخر کب آئیں گے تمھارے شرابی.......ذرا گھڑی تو دیکھو کیا بج رہا ہے (ٹائم پیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) معلوم پڑتا ہے آج بھی ایک بجے گا رات کا......تمھارا کیا ہے......
صبح دس بجے تک چادر تان کر لیٹے رہو گے مگر مجھے تو پانچ بجے اٹھنا ہے۔

نروان: (غصے میں) سن لیا ہے بھئی سُن لیا ہے.......تم چاہو تو سو جاؤ اندر جا کر........

رکتیما: تو کیا چپاتیاں تم بناؤ گے؟ یا تمھارے وہ شرابی...........

نروان: دیکھو جی.......یہ کیا بار بار شرابی ورابی لگا رکھا ہے.......زبان کو لگام دو اور جاؤ اندر ....

(دروازے پر آہٹ ہوتی ہے)

نروان: دیکھا......آ گئے وہ لوگ.......اب جاؤ اندر......

(رکتیما اندر جاتی ہے اور نروان آگے بڑھ کر دروازے کا پردہ ہٹاتا ہے۔ ایک ایک کر کے سدھاکرن، منوہر اور ست پتی اندر داخل ہوتے ہیں)

منوہر: (ٹیبل کی طرف دیکھ کر نعرہ بلند کرتے ہوئے) آہا...... آج تو لگتا ہے بڑا بھاری پروگرام ہے...... ہاں تو یارو! (سدھاکرن اور ست پتی سے مخاطب ہوکر) ہو جائے پھر نعرۂ تکبیر ....

سدھاکرن، ست پتی (مل کر اونچی آواز میں) ہاں ہو جائے........

منوہر: (چلا کر) نروان کمار کھنہ!

سدھاکرن، ست پتی: (مل کر اونچی آواز میں) ہپ ہپ ہرّے.........

منوہر: (اسی آواز میں) نروان کمار کھنہ!!

سدھاکرن، ست پتی: (اسی طرح مل کر) ہپ ہپ ہرّے........

نروان: (گھبرا کر) اماں ذرا آہستہ یار! پینے سے پہلے ہی شروع ہو گئے محلّہ اکٹھا کرنے کا ارادہ ہے کیا؟

منوہر: ابے ذرا خوش ہو لینے دے نہ......... برسوں بعد تو آج ہوسٹ بنا ہے تو...... کیوں ست پتی؟

ست پتی: (صوفے کی کرسی سرکا کر بیٹھتے ہوئے) صحیح ہے پیارے........

سدھاکرن: (ست پتی کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے) شاید یہ رات کل یگ کی آخری رات ہے........

(منوہر، ست پتی اور سدھاکرن کا ملا جلا قہقہہ)

منوہر: (میز کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے) ہاں تو مائی ڈیئر کھنہ...... لایئے ذرا دلہن کو ہمارے سامنے!

ست پتی: دلہن کا گھونگھٹ تو آج ہم کھولیں گے........

سدھاکرن: منظور...... گھونگھٹ تم کھولنا...... نتھ میں اتاروں گا........... (قہقہہ)

نروان: (بے چینی اور گھبراہٹ میں) اماں آہستہ یار!

منوہر: (طنزیہ لہجے میں) ہاں بھئی.......ایٹ کیٹ.......ایٹ کیٹ ازمسٹ (نروان سے مخاطب ہوکر) نروان! لاؤ یار.......جلدی کرو.......خاصی دیر ہوگئی.........

نروان: (بے چینی میں) پہلے ایک دور چائے کا ہو جائے........

سب مل کر: (حیرت سے) چائے........؟

منوہر: نونو........مائی ڈیئر........نوٹی........دِس ایوننگ نوٹی۔

نروان: (کھسیانا سا ہوکر) یارو! بات ایسی ہے کہ وہسکی لانے آدمی بھیج دیا گیا ہے بس اب آتا ہی ہوگا۔

منوہر: (حیرت سے) آدمی بھیجا ہے وہسکی لانے......اور اب؟

سدھاکرن: لیکن تم نے تو کہا تھا کہ اگنی ہوتری........

نروان: اسی کا تو رونا ہے پیارے......اسے دو بوتلیں لے کر آنا تھا......

منوہر: تو کہاں ہے وہ؟

نروان: ابھی ابھی اس کی ماں پرلوک سدھار گئی ہیں۔

سدھاکرن: وہ تو خیر اچھا ہوا..........بڑھاپے میں وہاں جانا ہی چاہیے......لیکن بوتلیں تو اس نے گھر میں منگوا رکھی ہوں گی........

نروان: مگر بھیا اگنی ہوتری کیسے آسکتا ہے اس حالت میں۔

منوہر: اوہو........وہ آئے نہ آئے ہمیں کیا.......لیکن بوتلیں تو بھجواتا کمبخت!

نروان: اسے اتنا ہوش ہی کہاں ہوگا یار!

منوہر: لیکن تم تو جاسکتے ہو بھئی..........

نروان: وہاں محلے بھر کی عورتیں جمع ہیں.......اور پھر میں پُرسہ دیئے تو اسے گیا نہیں...... بھلا اس کام کے لیے؟

ست پتی: تو اب چلے جاؤ ناں.......پُرسہ بھی دے آؤ.......اور بوتلیں بھی مار لاؤ۔

منوہر: بالکل صحیح ہے......ایک پنتھ اور دو کاج......بزرگ فرما گئے ہیں۔

نروان: اماں چھوڑو یار! لعنت بھیجو اگنی ہوتری پر........سہائے بس آتا ہی ہوگا......؟

منوہر: (حیرت سے) سہائے؟ کیا سہائے کو بھیجا ہے وہسکی لانے؟

(نروان اثبات میں سر ہلاتا ہے)

سدھا کرن: (بجھے ہوئے لہجے میں) وہ آچکا؟

منوہر: (طنزیہ انداز میں) کھنہ صاحب! سہائے آج کی تاریخ میں تو واقعی آچکا.......

نروان: ارے نہیں بھئی......بس آتا ہی ہوگا..........

منوہر: اماں کیوں بناتے ہو یار.......تم سے زیادہ ہم جانتے ہیں اسے ....وہ شراب لانے جائے اور واپس آئے۔

ست پتی: (بجھے ہوئے لہجے میں مصرع پڑھتا ہے)

اس کی فطرت میں نہیں لوٹ کے آنا یارو

سدھا کرن: میرا خیال ہے آج کی شام غارت جائے گی........

منوہر: (کھڑے ہوتے ہوئے) اٹھو یار......کھسکو یہاں سے ....کھنہ صاحب کے پروگرام تو ایسے ہی ہوتے ہیں........

نروان: اماں رکو بھی........سہائے ضرور آئے گا........بس آتا ہی ہوگا........پھر گھر میں کھانے کا بندوبست کر رکھا ہے........

منوہر: (چڑ کر) کھانا تو ڈیئر! اب ہوٹل میں ہی کھالیں گے۔

(ست پتی اور سدھا کرن بھی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں)

ست پتی: (بجھے ہوئے لہجے میں ایک اور مصرع پڑھتا ہے)

بڑے بے آبرو ہو کر تمھارے گھر سے ہم نکلے

(اچانک دروازے پر دستک ہوتی ہے)

نروان: (خوش ہو کر) دیکھا میں نہ کہتا تھا سہائے ضرور آئے گا......لو بیٹھ جاؤ اب؟

(نروان بڑھ کر پردہ سرکاتا ہے......لیکن سامنے سہائے نہیں اگنی ہوتری کھڑا ہے۔ پژمردہ سا، دائیں ہاتھ میں ایک تھیلا ہے اگنی ہوتری کو اچانک یہاں پا کر سب حیرت میں ڈوب جاتے ہیں)

نروان: (حیران و پریشان سا) بھئی بہت افسوس ہوا تمھاری ماں کی ڈیتھ کی خبر سن کر.......

ابھی ابھی دفتر سے لوٹا تو رکتیما نے بتایا......میں بھی آ ہی رہا تھا تمھارے پاس.........

منوہر: واقعی بہت افسوس ہے........

سدھاکرن: سو سیڈ..........

ست پتی: ویری سیڈ نیوز.........ہم ابھی آ رہے تھے تمھارے پاس.........

(اگنی ہوتری پژمردہ سا بدستور سر لٹکائے کھڑا ہے)

نروان: ہمت سے کام لو اگنی ہوتری.........ہمت سے کام لو..........

اگنی ہوتری: (غمگین آواز میں) معاف کرنا دوستو......میری وجہ سے آپ لوگوں کا یہ بنا بنایا پروگرام...........

نروان: (مصنوعی لہجے میں) ارے نہیں یار! کیسی باتیں کرتے ہو.........

پروگرام تو سالے بنتے ہی رہتے ہیں.........لیکن تمھاری ماں کی ڈیڈ کی خبر پا کر........

منوہر: (درمیان میں ٹوکتے ہوئے) ہم سب کا موڈ آف ہو گیا........

سدھاکرن: بڑی نیک عورت تھی..........

نروان: سارا محلہ پوجتا تھا اسے

اگنی ہوتری: (اسی غمگین آواز میں) اچھا نروان! میں اب چلتا ہوں.........

یہ تھیلا رکھ لو......(تھیلا نروان کے ہاتھ میں تھماتا ہے)

نروان: (حیران ہو کر) تھیلا.........؟

(سدھاکرن، منوہر اور ست پتی تینوں ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہیں)

اگنی ہوتری: بوتلیں ہیں اس میں.......

(ایک بار پھر سب ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہیں)

نروان: (مصنوعی لہجے میں) اماں اس کی کیا ضرورت تھی.......بھلا ایسی حالت میں.......

اگنی ہوتری: اچھا ــــــ چلتا ہوں......(سر جھکائے چپ چاپ کمرے سے نکل جاتا ہے)

(ایک منٹ کمرے میں مکمل خاموشی رہتی ہے۔سب ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے ہیں
—— حیرت، خوشی اور استعجاب کے موڈ میں)

منوہر: (خوشی سے تقریباً چلاتے ہوئے) تو ہو جائے پھر.........

سب مل کر: ہو جائے...........

منوہر: مسٹر تنیش اگنی ہوتری!

سب مل کر: ہپ ہپ ہرّے

منوہر: مسٹر تنیش اگنی ہوتری......!!

سب مل کر: ہپ ہپ ہرّے

(منوہر جھپٹ کر تھیلا نروان کے ہاتھ سے چھین لیتا ہے۔ ایک ایک کر کے دونوں بوتلیں نکالتا ہے۔ انہیں چومتا ہے اور پھر میز کے درمیان رکھ دیتا ہے۔ سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جاتے ہیں۔)

منوہر: (بوتل سدھا کرن کی طرف بڑھاتے ہوئے) ابے دیکھتا کیا ہے......اتار دے نہ دلہن کی نتھ.........

(سب کا ملا جلا پرزور قہقہہ بلند ہوتا ہے۔)

(پردہ)

کردار:

پانڈے
مسز پانڈے
روشن
گری دھر
زبیری

مسٹر پانڈے کے فلیٹ کا ڈرائنگ روم، پورے فرش پر رنگ دار پٹ سن کی دری بچھی ہے اوراس کے درمیان آٹھ فٹ لمبا اور آٹھ فٹ چوڑا غالیچہ دائیں طرف دیوار سے لگا بازوؤں والا قیمتی صوفہ، تپائیاں، میز اور ریڈیوگرام سلیقے سے رکھے ہیں۔ بائیں کونے میں نصف دائرہ نما صوفہ، تپائیاں اور قیمتی غلافوں سے ڈھکے موںڈھے اوران کے ساتھ کیبنٹ میں بند ٹی، وی سیٹ اس طرح کونے میں رکھا ہے کہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہر شخص ٹی-وی دیکھ سکتا ہے۔ ڈرائنگ روم کے عین وسط میں ایک بڑی سی گول میز ہے جس پر تانبے کی طشتری میں موسمی پھل پڑے ہیں۔ دائیں طرف صوفے سے ذرا آگے جانے کا راستہ ہے جو بیڈروم اور رسوئی کی طرف جاتا ہے۔ سامنے دیوار پر صرف ایک بڑی سی ماڈرن پینٹنگ آویزاں ہے۔ بائیں طرف ٹی، وی سیٹ کے پاس ایک کھڑکی ہے جس پر ریشمی پردہ پڑا ہے۔

پردہ اٹھنے پر پانڈے کے سوا اسٹیج پر کوئی نہیں ہے۔ وہ بائیں طرف والے صوفے پر آلتی پالتی مارے بیٹھا بڑے انہماک سے انگریزی روزنامہ پڑھ رہا ہے۔

پانڈے: (روزنامے کو سامنے تپائی پر پٹکتے ہوئے اپنے آپ سے) بھگوان جانے کس بدروح کا سایہ پڑ گیا ہے اپنے شہر پر......روز ایک قتل، روز ایک ڈکیتی......توبہ!!

(اچانک مسز پانڈے آدھا سیٹ چائے ٹرے میں لیے اندر داخل ہوتی ہے، ٹرے کو تپائی پر رکھتی ہے اور خود موںڈھے پر بیٹھ کر دو کپ بنانے لگتی ہے)

مسز پانڈے: عجیب زمانہ آ گیا ہے۔ اب تو گھر سے باہر جھانکتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے

(چائے کا ایک کپ پانڈے کی طرف بڑھاتی ہے، دوسرا خود اٹھاتی ہے۔ دونوں چسکیاں لے لے کر پینے لگتے ہیں۔)

پانڈے: (بُرا سا منہ بنا کر ہوا میں سونگھتے ہوئے) یہ بو کیسی ہے؟

مسز پانڈے: کہیں کچھ جل تو نہیں رہا؟

پانڈے: مجھے تو لگتا ہے، اس چائے میں کچھ ہے۔ (چائے کے کپ میں سونگھتے ہوئے) کوئی نئی پتی تو استعمال نہیں کی۔

مسز پانڈے: نہیں تو وہی آپ کی من پسند گرین لیبل ہی تو ہے لیکن (پانڈے کی طرح کپ میں سونگھتے ہوئے) چائے تو بالکل ٹھیک ہے (ہوا میں سونگھتے ہوئے) میرا خیال ہے کہیں ضرور کچھ جل رہا ہے؟

پانڈے: (چائے کا ادھ پیا کپ ٹرے میں رکھتے ہوئے) مجھے تو ربڑ جلنے کی بُو آرہی ہے کیوں؟

مسز پانڈے: (گھبرا کر کپ ٹرے میں رکھتے ہوئے) نہیں میرا خیال ہے کہیں کپڑا جل رہا ہے۔

پانڈے: (ہوا میں پھر سونگھتے ہوئے) شاید..... (آواز دیتا ہے) روشن ارے روشن۔

(رسوئی سے پانڈے کے نوکر روشن کی آواز آتی ہے) آیا بابو جی!

روشن: (ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر) جی......... بابو جی؟

پانڈے: ارے دیکھنا اندر کوئی کپڑا تو نہیں جل رہا؟

مسز پانڈے: دیکھو نہ کیسی بُو آرہی ہے؟

روشن: ہاں، آتو رہی ہے، لیکن اندر تو کچھ نہیں جل رہا۔

پانڈے: پھر شاید کہیں بجلی کا تار جل رہا ہوگا........

(اٹھ کھڑا ہوتا ہے) ذرا چیک کرو......... (مسز پانڈے بھی اٹھ کھڑی ہوتی ہے تینوں مل کر اِدھر اُدھر بجلی کے تار چیک کرنے لگتے ہیں)

مسز پانڈے: اس کمرے میں تو سب ٹھیک نظر آرہا ہے۔ روشن تم ذرا بیڈ روم رسوئی اور

دوسری جگہیں چیک کرلو۔

پانڈے: لیکن بوتو یہاں ڈرائنگ روم میں ہے۔

روشن: رسوئی میں تو بالکل کوئی بونہیں-البتہ میں دوسرے کمرے میں دیکھ لیتا ہوں۔

(چلا جاتا ہے)

پانڈے: (صوفوں کو ہٹا ہٹا کر دیکھتے ہوئے) کہیں چوہا تو نہیں مر گیا؟

مسز پانڈے: ہاں چوہا بھی ہوسکتا ہے........کتنی بار کہا ہے آپ سے ایک بلّی پال لیجئے.....

اتنے چوہے ہوگئے ہیں گھر میں کہ توبہ!

پانڈے: بھئی وہ دوا میں لایا تو تھا

مسز پانڈے: وہ موئی تو بالکل بے کار تھی

پانڈے: کیسے؟

مسز پانڈے: میں نے آٹے میں ملا کر اور اس کی چھوٹی چھوٹی گولیاں بنا کر ہر کونے میں رکھ دی تھیں۔

پانڈے: تب چوہے تو ضرور مرے ہوں گے۔

مسز پانڈے: خاک مرے ہوں گے، سارے کے سارے زندہ سلامت ہیں۔

پانڈے: یہ بھلا کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ ضرور اسی دوا کا اثر ہے کہیں نہ کہیں یقیناً کوئی چوہا مرا پڑا ہے۔ بلکہ ایک نہیں کئی........(وقفہ) جہاں جہاں گولیاں رکھی تھیں، وہاں وہاں فوراً چیک کرو۔ جلدی......

(مسز پانڈے دائیں اور بائیں پڑے صوفوں کے پیچھے جھانکتی ہے۔ زور زور سے سونگھتی ہے۔ پانڈے عجیب سا منہ بنائے اسے دیکھتا رہتا ہے)

پانڈے: کیوں کچھ ملا؟

مسز پانڈے: کوئی ہوتا تو ملتا بھی......موئی دوا........(شرارت سے چڑاتے ہوئے) آپ کی تو ہر چیز نقلی ہوتی ہے (معنی خیز انداز میں ہنسنے لگتی ہے)

پانڈے: (غصے میں) کیا کہا......! دیکھو جی!......ایسی باتیں مجھے بالکل پسند نہیں.......

یہاں بُو سے ناک سڑی جاتی ہے اور تمھیں مذاق سوجھ رہا ہے.........

(اتنے میں روشن اندر داخل ہوتا ہے)

روشن: بابو جی! میں نے ایک ایک کونہ دیکھ لیا ہے اور پھر اندر تو ذرا بھی بو نہیں ہے۔

مسز پانڈے: نہیں ہے؟

پانڈے: (روشن کو مخاطب کر کے) کہیں تمھاری ناک تو بند نہیں ہے؟

مسز پانڈے: ذرا اس کمرے میں سونگھ کر بتاؤ......آ رہی ہے بو؟

روشن: (زور سے سونگھ کر) یہاں تو............(وقفہ) لگتا ہے کچھ ہے۔

پانڈے: (قدرے غصّے میں) کیا ہے؟

روشن: یہ تو نہیں معلوم بابو جی......لیکن کچھ کچھ لگتا ہے.........

مسز پانڈے: لیکن ہم پوچھ رہے ہیں۔ یہ کچھ کچھ تمھیں کیا لگتا ہے؟

روشن: (کھسیانا ہو کر) معلوم نہیں بی بی جی.........

پانڈے: (تنگ آ کر) اچھا اچھا تم جاؤ.........رسوئی میں جا کر کام کرو۔

(روشن کھسیانا سا اندر چلا جاتا ہے)

پانڈے: (گویا اپنے آپ سے) سالا کہتا ہے۔ لگتا ہے......کچھ کچھ لگتا ہے.......(وقفہ) اور پھر مسز پانڈے سے، کچھ سوچتے ہوئے) دیکھو جی........مجھے لگتا ہے.......کہ یہاں کچھ نہ کچھ ہے ضرور........

مسز پانڈے: (شرارت آمیز ہنسی کے ساتھ) اب روشن کی طرح آپ کو بھی کچھ کچھ لگنے لگا ہے۔ کیوں؟

(اتنے میں گری دھر ڈرائنگ روم کی طرف آنے والے راستے کی طرف نمودار ہوتا ہے۔ ایک نظر بے ترتیب صوفوں اور تپائیوں پر ڈالتا ہے۔ پانڈے اور مسز پانڈے دونوں اس کی آمد سے بے خبر ہیں)

گری دھر: ارے بھئی یہ کیا........لگتا ہے تم دونوں میں ابھی ابھی یدھ بندی ہوئی ہے۔

پانڈے: (حیران ہو کر) اوہ.......گری.......آؤ........آؤ۔

گری دھر: بھئی ایک شبھ سماچار لایا ہوں ـــــ

پانڈے: کس لیے؟

گری دھر: بھئی پہلے بیٹھنے تو دو (دائیں طرف والے صوفے کو دیوار سے لگا کر بیٹھتے ہوئے) شبھ سماچار دونوں کے لیے ہے۔ یعنی پانڈے اور مسز پانڈے، دونوں کے لیے،

مسز پانڈے: تو پھر سنایئے نا بھائی صاحب!

پانڈے: (گری دھر کے پاس صوفے پر بیٹھتے ہوئے اصرار کے ساتھ) سناؤ نا یار!

گری دھر: سناتا ہوں بھئی...... ذرا دم تو لینے دو (مسز پانڈے سے) بھابھی! آپ پہلے گاجر کا حلوہ کھلوایئے۔ گرما گرم بہت دنوں سے آپ کے ہاتھ کا بنا ہوا حلوہ نہیں کھایا۔

مسز پانڈے: (بچوں کی سی ضد سے) پہلے سماچار تو سنایئے نا؟

گری دھر: نہیں ـــــ بالکل نہیں ـــــ رشوت پہلے اور کام بعد میں........ (ہنستا ہے)

پانڈے: (مسز پانڈے سے) دیکھو جی........ اپنا یار جو ہے نا سو پشتوں سے بنیا ہے...... پہلے اس کے پیٹ میں کچھ ڈالوگی تبھی تو اُگلے گا۔

گری دھر: (محبت سے)........ ابے جا........ نے گا پھر مجھ سے........

مسز پانڈے: اچھا اچھا میں ابھی لاتی ہوں حلوہ.......

(مسز پانڈے ڈرائنگ روم سے نکل جاتی ہے۔ وقفہ۔ گری دھر ہوا میں سونگھتا ہے)

پانڈے: (لاعلمی سے) کیوں..... کیا ہوا؟

(گری دھر ہوا میں پھر سونگھتا ہے۔ عجیب سا منہ بناتا ہے)

پانڈے: کیوں بھئی؟

گری دھر: (جیسے کچھ سوچتے ہوئے) یار! کچھ عجیب سی بو آ رہی ہے۔ کیوں؟ نہیں؟

پانڈے: (قدرے لاعلمی سے) ہاں...... کچھ کچھ لگتا تو ہے۔

گری دھر: لگتا نہیں ہے ـــــ (ہے پر زور دے کر) کوئی چوہا اودھا مرا پڑا ہے۔

پانڈے: لگ تو مجھے اور تیری بھابھی کو بھی رہا تھا۔

گری دھر: تبھی تو میں حیران تھا کہ آج پانڈے کا ڈرائنگ روم کوروکھیشتر کیسے بنا ہوا ہے۔

(پانڈے کی کھسیانی ہنسی) ادھر ادھر کونے میں دیکھا......؟

پانڈے: ہر کونے میں دیکھا ہے یار۔لیکن کچھ نہیں ملا۔

گری دھر: ذرا یہ کارپٹ اٹھا کر دیکھو........ضرور نیچے ہوگا (مسز پانڈے کو آواز دیتا ہے)

بھابھی......او بھابھی........!

(تھوڑے وقفہ کے بعد مسز پانڈے نمودار ہوتی ہے)

مسز پانڈے: کیا مجھے بلایا ہے؟

گری دھر: بھابھی ـــــ ذرا ہماری سہائتا کیجیے...... پانڈے اٹھو تم بھی آؤ........ ذرا کارپٹ اٹھا کر دیکھیں۔

(تینوں مل کر درمیان میں پڑی گول میز کو اٹھا کر ایک طرف رکھتے ہیں۔دونوں صوفوں اور تپائیوں کے نیچے سے کارپٹ ہٹاتے ہیں۔اتنے میں زبیری نمودار ہوتا ہے)

زبیری: (حیران سا) ارے بھئی یہ کیا؟........ پانڈے صاحب! خیریت تو ہے نا؟

گری دھر: اوہ تو آپ ہیں شریمان! جہاں آپ کے قدم پڑ گئے وہاں کھیریت کیسی؟

زبیری: لیکن یہ معاملہ کیا ہے؟ کیوں بھابھی جان؟

گری دھر: ارے بھابھی جی سے کیا پوچھتے ہو؟.....آرام سے کھڑے رہو اور تماشہ دیکھو۔

(تینوں مل کر کارپٹ اور غالیچہ ہٹانے لگتے ہیں)

زبیری: (سگریٹ سلگاتا ہے، کش لے کر) مجھے تو ایسا لگتا ہے پانڈے صاحب کے گھر میں انقلاب آگیا ہے۔

گری دھر: (ہنستے ہوئے) ابھی تک تو آیا نہیں۔البتہ آپ اگر تھوڑی دیر یہاں ٹھہرے رہے تو کرانتی یا انقلاب سچ مچ آجائے گا۔

زبیری: (کش لے کر) کاش ایسا ہو جائے۔میں تو چاہتا ہوں ہر گھر، ہر گلی، ہر بازار اور ہر شہر میں انقلاب آجائے۔ایسا انقلاب........

گری دھر: دیکھیے کرانتی کاری جی! اگر آپ نے کرانتی پر کوئی کویتا لکھی ہے.......

زبیری: کویتا نہیں...... نظم...... اُردو میں کویتا کو نظم کہتے ہیں!

گری دھر: اچھا نجم سہی...... جلدی سے سنائیے اور چھٹی کیجیے۔

زبیری: اماں نجم نہیں...... نظم...... ہندوستان میں رہتے ہو تو تھوڑی بہت اُردو بھی سیکھ لو شریمان گردھر؟

گری دھر: اور اگر تم بھی ہندوستان میں رہتے ہو تو تھوڑی بہت ہندی بھی سیکھ لو۔ میرا نام گری دھر ہے—— گری دھر...... گری دھر۔

(وقفہ) ہاں تو کرانتی کاری جی! ہو جائے پھر——؟

زبیری: دیکھئے جناب! آپ کو معلوم ہے کہ میں نے شاعری وائری بند کر دی ہے۔

پانڈے: (ہنستے ہوئے) تو کیا ادب میں انقلاب آ چکا؟

زبیری: ادب میں انقلاب لانے سے کیا ہوگا؟

گری دھر: نام ہوگا!

زبیری: کس کا؟

پانڈے! آپ کا...... اور کس کا؟

زبیری: جناب عالی! مجھے نام کی ضرورت نہیں۔ مجھے تو فکر ہے اس مُلک کی—— اس ملک میں رہنے والوں کی۔

گری دھر: لیکن پیارے! ہمیں اس وقت اس مردار چوہے کی چنتا ہے جو اس کمرے میں کئی دن سے مرا پڑا ہے اور بو پھیلا رہا ہے۔

زبیری: (قہقہہ لگاتے ہوئے) واہ! میرے ہوشمند عوام...... زندہ باد...... ایک چوہے کی موت پر یہ ہنگامہ!

پانڈے: چوہے کی موت پر نہیں—— اُس بُو کی بات کرو جو سارے کمرے میں پھیلی ہوئی ہے۔

زبیری: بُو...... کہاں ہے بُو؟

گری دھر: سونگھو...... ذرا زور لگا کر سونگھو...... اور پھر بتاؤ؟

زبیری: (ہوا میں سونگھ کر) بُو......بُو تو کہیں بھی نہیں۔اور اگر ہے بھی تو لائی سول چھڑک دو۔

پانڈے: کی ہے نا وہی بات تم نے.....شاعروں جیسی.....شاعری چھوڑ دی مگر شاعرانہ مزاج نہیں گیا۔

(پوری کارپٹ ہٹانے کے بعد بھی کچھ نہیں ملتا)

گری دھر: (تھک ہار کر ہانپتے ہوئے) سالا نہیں ملا۔

پانڈے: ملتا بھی کیسے؟ (زبیری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ہمارے انقلابی کے ڈر سے کہیں دور جا کر پڑا ہوگا بچارا۔

زبیری: کون؟ تم یا وہ—— تمھارا چوہا——!

گری دھر: پیارے کرانتی کاریوں سے چوہے ہی نہیں۔آدمی بھی ڈر جاتے ہیں۔

زبیری: (طنزاً) آدمی نہیں—— چوہے—— صرف چوہے—— (وقفہ) تم میں سے کسی نے پلیگ پڑھا ہے؟

پانڈے: (حیرت سے) کیوں......کیا یہ بیماری اب بھی کسی ملک میں Exist کرتی ہے؟

زبیری: کسی ملک میں کیوں؟ اپنے ملک کی بات کیوں نہیں کرتے؟

پانڈے: غدار.......

زبیری: کون.......؟ (طنزاً) ٹھیک کہتے ہو میاں! ہر احتجاج کرنے والے کو اسی لقب سے پکارا جاتا ہے........

گری دھر: (بناوٹی غصّے میں) پیارو.......! مجھے بہت کرودھ آ رہا ہے۔ یہ راج نیتک بات چیت بند کرو۔

زبیری: (اونچی آواز میں) یہ سیاسی گفتگو نہیں ہے شریمان۔ (تھوڑا رک کر ہر حرف پر زور دیتے ہوئے) شریمان گری دھر! (وقفہ) تم جانتے بھی ہو سیاست یعنی راج نیتی کسے کہتے ہیں.....؟

پانڈے: (گرمی دھر سے مخاطب ہو کر) ارے گری سنا تم نے اپنا شاعر تو.....ہندی شبدوں کا پریوگ کرنا بھی جانتا ہے.......

زبیری: (غصے میں) تو کیا...... (وقفہ) تم لوگوں کو میرے ہندوستانی ہونے پر شک ہے؟

گری دھر: (دونوں کو ٹوکتے ہوئے) دیکھو بھائی لوگو! مجھے بیچ بچ کرودھ آجائے گا۔ میں پھر چیتاونی دے رہا ہوں۔ اس گھر میں راجنیتک سمسیاؤں پر وارتالاپ نہیں ہوگا۔

مسز پانڈے: (پانڈے اور زبیری سے) بھائی صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں اب آپ لوگ جھگڑا بند کیجئے اور ذرا مل کر کمرے کا فرنیچر ٹھیک جگہ پر رکھوا دیجے۔

گری دھر: ارے ہاں بھئی..... بھابھی نے ٹھیک کہا۔ آؤ بھئی پانڈے!

(گری دھر، پانڈے، اور مسز پانڈے مل کر کمرے کی ہر چیز مقررہ جگہ پر رکھنے لگتے ہیں۔ زبیری بدستور کھڑا سب دیکھ رہا ہے۔ اتنے میں کمرے کا سارا فرنیچر سیٹ ہو جاتا ہے)

زبیری: (ہنس کر) تو میرے ہوشمند عوام! آپ کا مسئلہ حل ہوگیا؟

پانڈے: (گری دھر کے ساتھ صوفے پر بیٹھتے ہوئے) کون سا مسئلہ؟ ذرا بیٹھ کر بات کرو......

(زبیری دوسرے صوفے پر بیٹھ جاتا ہے۔ مسز پانڈے اندر چلی جاتی ہے)

زبیری: وہی......آپ کے مردار چوہے کا مسئلہ۔ جس سے آپ کے ڈرائنگ روم میں بو پھیلی ہوئی ہے۔

گری دھر: (ہوا میں سونگھتے ہوئے) پانڈے! ذرا سونگھو تو!

پانڈے: (حیرت سے) کیوں؟

گری دھر: ارے بھئی ذرا سونگھ کر تو دیکھو!

پانڈے: (زور زور سے ہوا میں سونگھ کر) کمال ہے..........

گری دھر: (آنکھ مار کر) ہے نا؟ کیوں؟

پانڈے: حد ہوگئی......اب تو بو کا نام و نشان نہیں ہے۔

گری دھر: مجھے تو لگتا ہے ہمیں خواہ مخواہ وہم ہوگیا تھا......کیوں زبیری؟

زبیری: ایسی بات نہیں ہے میاں! بو پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے......

گری دھر: ارتھات؟

زبیری: (طنزاً) ارتھات یہ مہاشہ! کہ بُو اب بھی ہے۔ بدستور ہے........صرف آپ کو عادت پڑ گئی ہے۔

پانڈے: (حیرت سے) کیا مطلب؟

زبیری: مطلب یہ ہے کہ گھنٹوں بُو سونگھتے رہنے سے آپ کے سونگھنے کی قوت ختم ہوگئی ہے۔ اب اگر اس کمرے میں کوئی گلی سڑی انسانی لاش بھی لاکر رکھدی جائے تب بھی آپ کو سڑاند نہیں آئے گی........

گری دھر: (غصے میں) دیکھو بھئی پانڈے! یہ کرانتی کاری ہمیں پھر راج نیتی کی اور لے جارہا ہے۔ بھگوان کے لیے اسے روک دو.......

زبیری: (سخت لہجے میں) کس بات سے روک دو؟ راج نیتی سے یا صحیح بات کہنے سے؟

گری دھر: (اونچی آواز میں) دونوں سے!

زبیری: تو کیا میں احتجاج بھی نہیں کرسکتا.....؟

پانڈے: کم سے کم اس گھر میں نہیں۔

زبیری: لیکن مجھے ہر گھر میں، ہر گلی اور ہر بازار میں اور ہر شہر میں احتجاج کرنا ہے (اٹھ کھڑا ہوتا ہے) اور تمہیں بھی......آج نہیں تو کل......آج نہیں تو کل........یہ سب کرنا ہی ہوگا........

(غصے میں باہر نکل جاتا ہے، دونوں اسے جاتا ہوا دیکھ کر ایک دوسرے کی طرف حیران نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اتنے میں مسز پانڈے ٹرے میں گاجر کے حلوے کی پلیٹیں لیے اندر داخل ہوتی ہے ٹرے دونوں کی طرف بڑھاتی ہے پانڈے اور گری دھر ایک ایک پلیٹ اٹھاتے ہیں)

مسز پانڈے: (حیرانی سے) ارے زبیری بھائی صاحب کہاں گئے؟

پانڈے: عجیب پاگل آدمی ہے یہ بھی!

گری دھر: بھابھی جانے دو اسے......گیا ہوگا کم بخت اب کسی دوسرے گھر میں لائی سول چھیڑنے۔ (تینوں مل کر ہنسنے لگتے ہیں)

(پردہ)

کردار:

گوسوامی
چپراسی
سردار جی
بنگالی
راکیش
اور دوسرے

کمپلینٹ

نومنزلہ عمارت کا گراؤنڈ فلور ـــــ سامنے لفٹ ہے جس کے دونوں دروازے بند ہیں۔ انڈیکیٹر کے مطابق لفٹ نویں منزل پر رکی ہے۔ لفٹ کے دائیں اور بائیں اوپری منزلوں پر جانے کے لیے سیڑھیاں ہیں۔ دائیں طرف سیڑھیوں کے ساتھ ایک بنچ پڑا ہے۔ اس عمارت کی کچھ منزلوں میں سرکاری اور غیر سرکاری دفاتر ہیں اور کچھ منزلوں میں رہائشی فلیٹ ـــــ ایک نوجوان جس کا نام گوسوامی ہے دائیں طرف سے، سیڑھیوں سے بہت ہٹ کر، دروازے سے اندر داخل ہوتا ہے۔

اس دروازے کے بالکل سامنے بائیں طرف بھی ایک دروازہ ہے۔ گوسوامی جلدی جلدی لفٹ کی طرف بڑھتا ہے بیل کا بٹن دباتا ہے پھر گھڑی کی طرف دیکھتا ہے... 'اف اوہ' کہہ کر پھر بٹن دباتا ہے۔ ذرا جھک کر لوہے کے لفٹ شٹرز سے اوپر کی طرف دیکھتا ہے :

گوسوامی: (اپنے آپ سے) میرا خیال ہے یہ بیل ہی خراب ہے (بٹن پر پھر انگوٹھے کا دباؤ ڈالتا ہے) ورنہ گھنٹی کی آواز تو آنی ہی چاہیے (شٹرز پر زور زور سے ہاتھ مارتا ہے) ارے بھئی نیچے آؤ....... (اونچی آواز میں) ار.......ے بھ بھ بھاااائی....... (وقفہ) انڈیکیٹر کی بتی تو جل رہی ہے...... لفٹ خراب نہیں ہو سکتی..... (شٹرز پر پھر ہاتھ مارتا ہے) لیکن نویں منزل پر کیا اندرا گاندھی کا بھاشن ہو رہا ہے؟ (اونچی آواز) لفٹ مین صاب ب ب..... (اپنے آپ سے) صاب کی ایسی تیسی! نہ جانے کیا کر رہا ہے۔ لفٹ مین الو کا پٹھا...... (وقفہ)... لفٹ مین صاب ب ب ......ابے اب آ بھی جا....... سیرے ڈھول جانی....... (ذرا سُر میں) تیری مہربانی..... نیچے چلا آ

...... تیری مہربانی....... (وقفہ)....... (پھر ریسٹ واچ دیکھتا ہے) اف اوہ....... تین بجکر پندرہ منٹ ......دیٹ مینس کوارٹر پاسٹ تھری........ مائی گڈنیس۔ (دیر تک شٹرز پر ہاتھ مارتا ہے، کبھی بیل کا بٹن دباتا ہے۔ اتنے میں بائیں طرف سے چپراسی داخل ہوتا ہے اور بنچ پر بیٹھ جاتا ہے گوسوامی کو ایک نظر دیکھتا ہے پھر بیڑی سلگا کر پینے لگتا ہے)

گوسوامی: (چپراسی سے مخاطب ہو کر) ارے بھئی یہ لفٹ کا کیا معاملہ ہے؟

چپراسی: خراب پڑی ہے بابو

گوسوامی: ہائیں......؟ خراب پڑی ہے؟ کب سے؟

چپراسی: کوئی گھنٹہ بھر ہو گیا ہے۔

گوسوامی: گھنٹہ بھر؟ کب تک ٹھیک ہوگی؟

چپراسی: یہ تو رام ہی جانے بابو

گوسوامی: لیکن بھیا مجھے تو بہت جلدی......اوپر پہنچنا ہے۔

چپراسی: (ہنس کر) اوپر پہنچنا ہے؟ کون سی منزل پر؟

گوسوامی: نویں منزل.......وہاں میرے ایک دوست ہیں......فلیٹ نمبر گیارہ میں۔

چپراسی: وہاں تو کوئی ششی کانت بابو رہتے ہیں۔

گوسوامی: ہاں ہاں وہی.....انہی سے تو ملنا ہے مجھے........تم جانتے ہو انھیں؟

چپراسی: وہ تو ہماری بغل میں رہتے ہیں.........

گوسوامی: تمہاری بغل میں.......؟

چپراسی: (دانت نکال کر ہنستے ہوئے) ہمارا دفتر 10 نمبر میں ہے......اور وہ 11 میں.......

گوسوامی: کون سے دفتر میں ہو........ ؟

چپراسی: کتابوں وتابوں کا کاروبار ہے.......

گوسوامی: اوپر کب جاؤ گے؟

چپراسی (ہنستا ہے) اوپر؟........ ہاں! پہلے لفٹ تو ٹھیک ہو جائے بابو..... کھڑے کیوں ہو........بیٹھ جاؤ بنچ پر........

اسنے میں ایک سردار جی بائیں طرف کی سیڑھیوں سے اترتے ہیں۔گوسوامی بڑھ کران کے قریب جاتا ہے)

گوسوامی: سردار جی.....ست سری اکال.........

سردار جی! ست سری اکال.....کی گل اے؟

گوسوامی! آپ اوپر سے آرہے ہیں؟

سردار جی! تے ہور کی.........تھلّوں آرہاں؟

گوسوامی! میرا مطلب ہے کون سی منزل سے؟

سردار جی: نویں منزل توں........ہور کچھ پڑاں ہے کچھ؟

گوسوامی: میرا مطلب ہے یہ لفٹ........

سردار جی: او......گولی مارو جی لفٹ نوں......ایتھے تاں روز ہی ایہو دھندہ ہے......دوسو سیڑھیاں چڑھواترو، تاں گھر جا کے لے پیٹے جاؤ.........

(اتنا کہہ کر سردار جی دائیں دروازے سے باہر نکل جاتے ہیں گوسوامی بنچ پر بیٹھ جاتا ہے۔ گھڑی کی طرف دیکھتا ہے۔پھر چپراسی کی طرف مخاطب ہوتا ہے۔

گوسوامی اتنے سارے لوگ اس بلڈنگ میں رہتے ہیں......مل کر کمپلینٹ کیوں نہیں کرتے.........

چپراسی: کس کی؟

گوسوامی: اس لفٹ کی........کیا ہمیشہ بند رہتی ہے؟

چپراسی: بابو........مشین مشین ہے پل میں ٹھیک پل میں خراب.......

گوسوامی: لیکن اس کی پروپر کمپلینٹ ہونی چاہیے.........

(اچانک ایک نوجوان دائیں طرف سے نکلتا ہے اور بائیں طرف کی سیڑھیوں کی طرف بڑھتا ہے......گوسوامی اس سے مخاطب ہوتا ہے)

گوسوامی: سنیے........

نوجوان: (ریسٹ واچ دیکھتے ہوئے) ساڑھے تین........

گوسوامی: میں نے ٹائم نہیں پوچھا جناب!........ میں تو یہ جاننا چاہتا تھا کہ آپ کون سے فلور پر جا رہے ہیں؟

نوجوان: تھرڈ فلور........(لپک کر سیڑھیاں چڑھنے لگتا ہے)

گوسوامی: آپ لوگ مل کر کمپلینٹ کیوں نہیں کرتے؟

نوجوان: کس بات کی کمپلینٹ؟

گوسوامی: لفٹ والوں کی.......

نوجوان: ہمیں کیا پڑی ہے صاحب.......اگر چھوٹی چھوٹی بات کی کمپلینٹ کرنے لگیں تو آدھا دن اسی میں غرق ہو جائے.......اور پھر ہم تو تھرڈ فلور پر ہیں........ کمپلینٹ تو اوپر والوں کو کرنی چاہیے...... ہم اگر کہیں آٹھویں، نویں فلور پر ہوتے تب دیکھتے کیسے بند ہوتی ہے یہ لفٹ.....

(کہہ کر نوجوان جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھ جاتا ہے۔ گوسوامی پھر بنچ پر آ کر بیٹھ جاتا ہے)

گوسوامی: عجیب لوگ ہیں اس بلڈنگ والے بھی........ (چپراسی سے مخاطب ہو کر) تمھارے پاس پین ہے........

چپراسی: پین تو نہیں پنسل ہے...... (جیب سے پنسل نکال کر) لو بابو.....

گوسوامی: پنسل نہیں بھئی.......پین چاہیے...... (اپنی جیبیں ٹٹولتا ہے) شاید گھر میں رہ گیا کہیں......ممکن ہے گر گیا ہو.........تھا تو سہی.......سنو.......لفٹ کی کمپلینٹ کہاں کرنی ہوتی ہے؟

چپراسی! معلوم نہیں بابو.....ہم نے تو کبھی کی نہیں۔

(ایک بنگالی آفیسر بائیں طرف سے نکل کر سیڑھیوں کی طرف لپکتا ہے)

گوسوامی: سنیے.......

بنگالی: کیا؟

گوسوامی: اس لفٹ کی کمپلینٹ کہاں کرنی چاہیے؟

بنگالی: کمپلینٹ ....؟ کیسا کمپلینٹ........؟

گوسوامی: یہ لفٹ بند پڑی ہے بہت دیر سے.......

بنگالی: تو ہونے دو.......یہ تو روز بند رہتا ہے........

گوسوامی: اگر روز اس کی کمپلینٹ ہو تو یہ کبھی بند نہ ہو........

بنگالی: تو پھر کر دو نہ کمپلینٹ .... پوچھتا کاہے کو ہے....... کمپلینٹ کرنے سے کیا ٹھیک ہو جائے گا یہ.........

گوسوامی: کیوں نہیں.......میں کرتا ہوں کمپلینٹ.....ذرا اپنا پین دیجیے........

بنگالی: پین.......

گوسوامی: ہاں......ابھی کمپلینٹ لکھ کر دیتا ہوں....بس پانچ منٹ........

بنگالی: پانچ منٹ کیسے انتظار کرے گا جی....... پانچ منٹ میں تو ہم ففتھ فلور پر پہنچ جائے گا۔

(جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھ جاتا ہے)

(اتنے میں ایک اور نوجوان دائیں طرف سے داخل ہو کر لفٹ کی طرف بڑھتا ہے۔ بیل کا بٹن دباتا ہے۔ شٹرز پر ہاتھ مارتا ہے......پھر بٹن دباتا ہے......وقفہ......گوسوامی سے مخاطب ہوتا ہے)

نوجوان: لسن.......یہ لفٹ کو کیا ہوا؟

گوسوامی: آؤٹ آف آرڈر ہے........

نوجوان: آؤٹ آف آرڈر؟ کب سے؟

گوسوامی: بہت دیر ہو گئی.......میں بھی اس کے ٹھیک ہونے کا انتظار کر رہا ہوں......آپ کو کون سے فلور پر جانا ہے؟

نوجوان: فرسٹ فلور......آپ نے اس کی کمپلینٹ لکھوائی؟

گوسوامی: ابھی تک تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ کمپلینٹ کرنی کہاں ہے؟.......لیکن آپ تو جائیے......آپ کو تو فرسٹ فلور تک جانا ہے دس پندرہ سیڑھیاں ہوں گی۔

نوجوان: سیڑھیوں سے کیوں؟ جب لفٹ لگی ہے تو سیڑھیوں سے کیوں جائیں؟

گوسوامی: تو پھر آئیے......آپ بھی بیٹھیے......انتظار کرتے ہیں......پین ہے آپ کے

پاس؟

نوجوان: پین......؟

گوسوامی: ہاں...... کمپلینٹ لکھتے ہیں......

نوجوان: کمپلینٹ وملپینٹ سے کچھ نہیں ہوگا جناب......کوئی عملی قدم اٹھایئے........

گوسوامی: کیا مطلب.......؟

نوجوان: مطلب یہ ہے کہ جب تک لفٹ ٹھیک نہیں ہوجاتی...... کسی کو بھی سیڑھیوں سے اوپر نہ جانے دیا جائے......اور نہ ہی کسی کو اوپر سے نیچے آنے دیا جائے......پھر دیکھئے لفٹ کیسے نہیں ٹھیک ہوتی........

گوسوامی: واہ......یہ تو خوب ہے........

نوجوان: (آنکھ مار کر) ایڈونچر رہے گا.......

گوسوامی: آپ تو واقعی بااصول آدمی ہیں......آپ کا تعارف..... ؟

نوجوان: ایم-اے فائنل کا اسٹوڈنٹ ہوں......راکیش کمار شرما........میرے فادر راجیہ سبھا کے ممبر ہیں.........

گوسوامی: (راکیش سے ہاتھ ملاتے ہوئے) گلیڈ ٹو میٹ یو......آئی ایم ٹی، گوسوامی..... منسٹری آف فوڈ میں انسپکٹر ہوں۔

راکیش: ویری مچ گلیڈ ٹو سی یو......اچھا مسٹر گوسوامی......آپ ادھر سیڑھیوں کے پاس کھڑے ہوجایئے........ادھر رائٹ ہینڈ پر...... (اتنے میں ایک ادھیڑ عمر کا آدمی دائیں طرف سے داخل ہوتا ہے اور سیڑھیوں کی طرف بڑھتا ہے)

ارے صاحب........آپ کہاں.......؟ کہاں جارہے ہیں آپ؟

ادھیڑ عمر کا آدمی: اوپر...... یوتھ فورم کے دفتر میں...........

راکیش: جب تک لفٹ ٹھیک نہ ہو آپ اوپر نہیں جاسکتے.........

ادھیڑ عمر کا آدمی: ارے بھئی سیڑھیاں جو ہیں..........

راکیش: اگر آپ کی طرح ہر آدمی سیڑھیوں سے اوپر آنے جانے لگے تو یہ لفٹ دس سال

میں بھی ٹھیک نہیں ہوگی........ ہمیں بھی اوپر ہی جانا ہے.........

ادھیڑ عمر کا آدمی: کمال ہے صاحب.......

گوسوامی: آدمی کے کچھ اصول ہونے چاہئیں جناب...... شرما جی ٹھیک کہہ رہے ہیں...... آپ کو اس کام میں ہماری مدد کرنی چاہیے.........

راکیش: اچھا مسٹر گوسوامی........ آپ چلئے مورچہ سنبھالئے اپنا.......

(ادھیڑ عمر کے آدمی سے مخاطب ہوکر) آپ میرے ساتھ آیئے......

(دائیں طرف سیڑھیوں کے پاس دونوں کھڑے ہوجاتے ہیں...... اتنے میں ایک بزرگ اوپر سے سیڑھیاں اترتے ہوئے نظر آتے ہیں)

راکیش: ٹھہریئے شریمان جی....... ٹھہریئے........ اوپر جایئے آپ...... سیڑھیوں سے اترنا منع ہے.........

بزرگ: کیوں، کیوں........

راکیش: شریمان جی آپ سے کہا تو ہے سیڑھیوں سے اترنا منع ہے..... لفٹ سے آیئے ....

بزرگ: ارے بھائی لفٹ آؤٹ آف آرڈر ہے........

راکیش: تو ٹھیک ہونے تک انتظار کیجئے........ جایئے اوپر.........

بزرگ: بڑی زیادتی ہے آپ کی........

(اتنے میں دائیں طرف کی سیڑھیوں سے دو لڑکیاں اترتی ہیں)

راکیش: مسٹر گوسوامی........ پیچھے روکئے انہیں........ بہن جی، رک جایئے۔

گوسوامی: آپ لوگ اوپر چلئے...... لفٹ سے آیئے........

ایک لڑکی: کیوں....... یہ کیا مذاق ہے؟

دوسری لڑکی: آپ کو معلوم نہیں لفٹ خراب پڑی ہے......؟

(اتنے میں تین آدمی دائیں طرف سے اور ایک عورت اور مرد بائیں طرف سے داخل ہوتے ہیں اور سیڑھیوں کی طرف بڑھتے ہیں)

راکیش: مسٹر گوسوامی......آپ ان تینوں کو روکیے..... (پھر مرد اور عورت سے مخاطب ہو کر)
ماتا جی......رکیے آپ بھی.....شریمان جی آپ بھی.........

گوسوامی: رک جایئے صاحبان.......سب لوگ رک جایئے........

تینوں آدمی: کیوں صاحب کیوں؟

راکیش: سنیے سنیے.......جھگڑا کرنے کی ضرورت نہیں ہے.......میں بتاتا ہوں آپ کو.....

(اتنے میں دو آدمی دائیں طرف کی سیڑھیوں سے اترتے ہیں اور ایک آدمی بائیں طرف سے داخل ہوتا ہے۔ چپراسی اسی طرح بنچ پر بیٹھا بیڑی پی رہا ہے اور تماشا دیکھ رہا ہے)

(تقریر کے انداز میں) حضرات! لفٹ پچھلے کئی گھنٹوں سے خراب پڑی ہے.......اگر ہم اور آپ اسی طرح سیڑھیوں سے آتے جاتے رہے تو یقین جانیے....ہماری تکلیف کا کسی کو احساس نہیں ہوگا.......اور یہ لفٹ کبھی ٹھیک نہیں ہوگی.......بہتر یہی ہے کہ ہم سب مل کر سیڑھیوں کا بائیکاٹ کریں.......نہ کوئی اوپر سے نیچے آسکے اور نہ نیچے سے اوپر جاسکے..........

گوسوامی: (راکیش کی طرح تقریر کے انداز میں) آپ ان لوگوں کی تکلیف کا اندازہ کیجیے جو آٹھویں، نویں فلور پر رہتے ہیں۔ اگر نچلی فلور والے یہ سوچیں کہ ان کا گزارہ تو سیڑھیوں سے ہو سکتا ہے تو پھر بتایئے اوپر والوں کا کیا ہوگا.........

راکیش: (بدستور تقریر کے انداز میں) آپ لوگ آزاد ہندوستان میں رہتے ہیں.......آپ کے کچھ اصول ہونے چاہئیں.........

(اتنے میں ایک 23 سالہ نوجوان سیڑھیوں سے اترتا اور راکیش سے مخاطب ہوتا ہے)

23 سالہ نوجوان: ارے راکیش تم.......تم یہاں کھڑے ہو......؟
میں اوپر کب سے تمہارا انتظار کر رہا تھا.........

راکیش: آؤ......آؤ.........

23 سالہ نوجوان: یہ کیا تماشا ہے.........

راکیش: تمھاری لفٹ خراب پڑی تھی......میں نے سوچا (آنکھ مار کر).......ذرا ایڈونچر ہو جائے............

23 سالہ نوجوان : کیا مطلب....... ؟

راکیش : سیڑھیوں سے سب کا آنا جانا بند.......ابھی دیکھنا ایک ہزار آدمی جمع ہو جائے گا ......کیا خیال ہے.....ہے نا ایڈونچر...... ؟

23 سالہ نوجوان : بھئی واہ....... یہ اچھی ترکیب ہے..... (وقفہ) اچھا چلو.......دیر ہو رہی ہے.....جلدی نکل چلو........

(دونوں آخری سیڑھی سے اتر کر آگے بڑھتے ہیں۔ راکیش بزرگ سے مخاطب ہوتا ہے)

راکیش : شریمان جی.......مورچہ سنبھال لیجئے......دیکھئے کوئی آنے جانے نہ پائے (پھر گوسوامی سے مخاطب ہو کر) مسٹر گوسوامی.......اسی طرح ڈٹے رہیے مورچے پر........ایک بھی آدمی اترنے یا چڑھنے نہ پائے........ذرا اور الرٹ ہو جائیے.......... (اپنے دوست کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے اُونچی اُونچی آواز میں) اچھا........پھر ملیں گے.......وِش یو گڈ لک مسٹر گوسوامی ......(ہاتھ ہلاتے ہوئے اپنے دوست کے کندھے پر ہاتھ رکھے دروازے کی طرف بڑھ جاتا ہے)

(پردہ)

کردار:

دیال
منیش
انجنا
روہت

چور

ڈرائنگ کم بیڈروم- بائیں طرف ڈبل بیڈ، اور دائیں طرف ریکسین کا صوفہ سیٹ اور میز- دائیں طرف ہی الماری اور اس کے قریب ہی میز پر پڑا ہوا ریڈیو- بائیں طرف دو دروازے ہیں، پہلے دروازے پر پردہ اا اور دوسرا بغیر پردے کے- دوسرا دروازہ کچن کی طرف جاتا ہے اور پہلا دروازہ کمرے میں آنے جانے کے لیے- کمرے میں چند اور ضروری چیزیں بھی سلیقے سے رکھی ہیں- پردہ اٹھنے پر، کمرے میں کوئی نہیں ہوتا اس کے فوراً بعد دیال پہلے دروازے سے پردہ ہٹا کر اندر آتا ہے، اور پردے کو پکڑے ہوئے ہی منیش کو جو ابھی دروازے سے باہر ہے، آواز دیتا ہے-

دیال : ارے بھئی آؤ نا، رُک کیوں گئے؟

(منیش کا کمرے میں داخلہ)

آؤ.....آؤ (ہنس کر) اچھے بچے شرمایا نہیں کرتے-

منیش: (شکل وصورت سے خاصا سنجیدہ نظر آتا ہے، طنزیہ انداز میں) جو آگیہ پتا جی-

دیال: ہاں! یہ ہوئی نہ بات (قہقہہ مار کر) عجیب بات ہے منیش تم میں ذرّہ بھر تبدیلی نہیں آئی، ویسے ہی چپ چاپ اور فرماں بردار ہو تم-

منیش : اچھا اچھا، اب کہیں بٹھاؤ گے بھی یا یونہی کھڑا کیے رکھو گے-

دیال : تو کیا اس کے لیے بھی میری اجازت کی ضرورت؟ چل بیٹھ (کندھے پر دباؤ ڈال کر منیش کو صوفے پر بٹھا دیتا ہے)

اچھا پہلے یہ بتا، کیا پیئے گا ؟

منیش: جو تمھارا جی چاہے۔

دیال :تو لے (جیب سے ماچس اور سگریٹ کی ڈبیاں نکال کر میز پر رکھتے ہوئے) پہلے دو ایک کش لگا۔ اور پھر بتا، رم نکالوں یا وہسکی؟

منیش :(سگریٹ سلگا کر) شراب اور اب نہیں پیوں گا۔ صرف چائے کا ایک کپ اور اس کے بعد (کش لے کر دھواں اُڑاتے ہوئے) یہاں سے اپنی روانگی۔

دیال : دماغ چل گیا ہے تیرا؟ جانتا بھی ہے کتنے عرصے بعد ہم ملے ہیں۔ بتا ؟

منیش : یہی کوئی پانچ، چھ برس بعد ـــــ

دیال :تو کیا آج شام سلیبریٹ نہیں کریں گے۔

منیش : ڈیر دیال! مجھے بہت سے کام کرنے ہیں۔ صبح لوک سبھا گیا تھا، اسے کور کرنا ہے، اور کل رات ایک اٹیلین شاعر کا انٹرویو لیا تھا، وہ بھی لکھنا ہے۔

دیال : مجھے معلوم ہے کہ جناب بہت ہی مصروف آدمی ہیں۔ ایک ہم ہی ہیں جو بے کار ہیں۔

منیش : نہیں نہیں ایسی بات نہیں........ (وقفہ) اچھا تو ہو جائے پھر تم بھی کیا یاد کرو گے۔

منیش : لیکن میں پہلے ہی کہے دیتا ہوں، صرف دو پیگ لوں گا۔

دیال : (ہنس کر) تو شروع تو کر یار........ میں اچھی طرح جانتا ہوں تجھے۔

منیش : اب وہ بات نہیں رہی دیال.....زیادہ پی لوں تو طبیعت خاصی خراب ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹروں نے بالکل منع کر رکھا ہے۔

دیال : اچھے بھلے تو ہو یار......دیکھو اب گڑبڑ نہیں کرو......... (اٹھ کر الماری سے وہسکی کی بوتل اور شیشے کے دو گلاس نکال کر میز پر رکھ دیتا ہے۔ پھر کچن سے پانی بھرا جگ لاتا ہے) یہ شراب ہے یار! کچھ احترام کرو اس کا......تمہارا ہی تو جملہ ہے یہ.........

منیش : (پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ) کبھی تھا........ (وقفہ) لیکن اب تو ڈیر سب کچھ بھلا دینے کو جی چاہتا ہے۔

دیال : کیا دیال کو بھی.........

منیش : معلوم نہیں کیا ہوگیا ہے (کربناک لہجے میں) ۔
جو بھی کچھ تھا اسی کے دم سے تھا

دیال : (بوتل کا ڈھکن کھول کر دو ہیوی پیگ بناتا ہے) لے، اٹھا یار!
(دونوں اپنا اپنا گلاس اٹھاتے ہیں۔ دیال ایک ہی گھونٹ میں سارا گلاس حلق میں انڈیل لیتا ہے۔ منیش دھیرے دھیرے سپ کرتا ہے دونوں سگریٹ کے لمبے لمبے کش لیتے ہیں)

دیال : (اونچی آواز میں اپنی پتنی انجنا کو آواز دیتا ہے) انجو دوو!

منیش : (چونک کر) کون ؟

دیال : تمہاری بھابی...... (منیش کا گلاس خالی نہ پا کر) اٹھا یار! ایک ہی جھٹکے میں پی جا اب، پہلا پیگ تو تمہارے اصول کے مطابق ایک ہی سانس میں ختم ہونا چاہیے۔

منیش : تم اپنا پیگ بناؤ...... میں تیسرے پیگ میں تمہارا ساتھ دوں گا۔

دیال : دیکھ یار...... غلط بات نہیں ہوگی...... شراب کے معاملے میں ہم آج بھی تمہارے اصولوں پر عمل کر رہے ہیں۔ کیا بھول گیا سب......

منیش : کہا تو ہے تم سے...... اب تو...... سب کچھ بھول جانے کو جی چاہتا ہے (اتنے میں سامنے والے دروازے کا پردہ ہٹا کر انجنا اندر داخل ہوتی ہے۔ منیش کو دیکھ کر ایک دم چونکتی ہے۔ منیش بھی حیران سا اسے دیکھتا ہے۔ دونوں گویا ایک دوسرے سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ انجنا کے چہرے پر دھیرے دھیرے ناگواری اور غصے کے اثرات جھلکنے لگتے ہیں)

دیال : انجو...... یہ منیش ہے...... میرا بہت ہی اچھا دوست۔
(منیش اور انجنا دونوں ایک دوسرے کو حیران نظروں سے دیکھتے ہیں)
بھئی کچھ کھانے کو لے آؤ ـــــ کچھ نمکین.........
(انجنا بغیر کچھ کہے کچن میں چلی جاتی ہے)

دیال : (اپنا اور منیش کا پیگ بناتے ہوئے) یار! اپنی بیوی بہت ہی اچھی ہے...... بہت ہی نیک.........

منیش : بیویوں کو نیک ہونا ہی چاہیے۔

دیال : (دوسرا پیگ بھی ایک ہی سانس میں پی جاتا ہے، اب نشہ اس پر طاری ہونا شروع ہوگیا ہے) چاہیے نہیں......."ہے" (ہے پر زور دے کر) میرے یار 'ہے' اگر یہ نہ ملتی تو پیارے اب تک کھنڈر ہوگئے ہوتے ہم! جینے کا مقصد......... (فلسفیانہ انداز میں) شادی کے بعد ہی سمجھ میں آتا ہے...... (منیش جیسے اپنے خیالات میں مگن ہے اور دھیرے دھیرے سپ کر رہا ہے، دیال جھنجھلا کر) یار سُن رہے ہو یا نہیں، اماں تم سے کہہ رہا ہوں.........

منیش : (جیسے چونک کر) سن رہا ہوں ڈیر، غور سے سن رہا ہوں۔

دیال : یار.......اب تو بھی ایک شادی کرڈال! سچ کہتا ہوں مست رہو گے.........اپنی طرح..........

منیش : (ہونٹوں میں مسکراتے ہوئے) ہوں ں ں..........

دیال : (اٹھتے ہوئے) یار.......میں ابھی آتا ہوں.......ذرا یورنل ہوآؤں۔

(سامنے والے دروازے سے نکل جاتا ہے اتنے میں انجنا پلیٹ میں نمکین لیے کچن سے باہر آتی ہے اور پلیٹ کو منیش کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے، اسے غصے سے دیکھتی ہے)

منیش : (پیار سے) کیسی ہو انجو......... ؟

انجنا : (غصے سے) تم یہاں کیوں آئے ہو؟

منیش : (حیران سا) اتنا غصہ ؟

انجنا : تم فوراً چلے جاؤ یہاں سے........ورنہ ؟

منیش : ورنہ.........؟

انجنا : ورنہ میں سب کچھ کہہ دوں گی ان سے.........

منیش : کیا کہو گی ؟

انجنا : سب کچھ.......سب کچھ کہہ دوں گی ان سے............

منیش : کیا کہو گی ؟

انجنا : سب کچھ.........سب کچھ کہہ دوں گی.........اب خیریت اسی میں ہے کہ تم یہاں سے فوراً نکل جاؤ.........

منیش : (جیسے کچھ یاد کرتے ہوئے) تم.......اب بھی ویسی ہی غصیلی ہو.........لیکن مجھے تمہارا غصہ اچھا لگتا ہے...........دراصل تمھیں حق بھی ہے مجھ سے جھگڑنے کا........

انجنا : تم پر کوئی حق نہیں میرا..........

منیش : کبھی تھا تو سہی.........

انجنا : ہوگا.......لیکن اب نہیں.......بالکل نہیں......تم چلے جاؤ
اب........میری زندگی میں آگ لگانے یہ تم کہاں سے نکل آئے۔

منیش : (پیار سے) انجو.......اتنے دنوں بعد ہم ملے ہیں۔کم از کم اتنا تو پوچھا ہوتا کہ منیش.......تم کیسے ہو ؟

انجنا : تم کون لگتے ہو میرے ؟ کیا رشتہ ہے مجھ سے تمہارا ؟

منیش : رشتہ ؟(ہنس کر) رشتہ تھا بھی اور ہے بھی..........
(وقفہ) انجو........وہ کہاں ہے ؟(اشتیاق سے) میرا خون........

انجنا : (بدستور غصے میں) بھول جاؤ اسے..........

منیش : کیسے بھول جاؤں ؟

انجنا : میں اس پر تمھارا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گی۔

منیش : صرف ایک بار انجو......صرف ایک بار مجھے اس کی صورت دکھا دو.........میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں........صرف دیکھنا۔

انجنا : تم اسے نہیں دیکھ سکتے......کبھی نہیں۔

منیش : اتنی کٹھور نہ بنو انجو..........

انجنا : میرا نام انجو نہیں.......انجنا ہے.....مسز انجنا........مسز انجنا دیال! سمجھے؟

منیش : ہاں! ٹھیک کہتی ہو تم.......میں نہ جانے کیوں ایک لمحے کے لیے یہ بھول گیا تھا کہ میں مسز دیال سے بات کر رہا ہوں.......(وقفہ)
مسز دیال! مجھے اس کی صرف جھلک دکھا دو.........بس! پھر میں یہاں سے چلا جاؤں گا........

انجنا : اور یہ بھی وعدہ کرو کہ یہاں.........اس گھر میں.......میرے اس مندر میں پھر کبھی نہیں آؤ گے.........

منیش : ہاں.........میں وعدہ کرتا ہوں.......مسز دیال! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔

انجنا : مجھے تم پر کوئی بھروسہ نہیں..........یاد کرو وہ دن جب میں کلنک سے بچنے کے لیے تمھارے دروازے پر آئی تھی.......اپنا سب کچھ لے کر تمھاری جھولی بھرنے آئی تھی.......مگر تم نے میری ایک نہ سنی...........(روہانسی ہو کر) اور اس بھرے سنسار میں مجھے اکیلا چھوڑ دیا.....یہ بھی نہ سوچا کہ اپنے پیٹ میں بچہ لے کر میں کہاں جاؤں گی.........

منیش : بس کرو انجو.......بس کرو.......بھول جاؤ وہ سب! دراصل میں بے قصور تھا...... کچھ مجبوریاں تھیں.........

انجنا : ایسی بھی کیا مجبوریاں تھیں جو مجھے کلنک سے بچانے سے روک رہی تھیں۔

منیش : سچ مانو انجو.......سوری......مسز دیال.......میں دراصل گھبرا گیا تھا......نہ جانے وہ کیسا نامراد لمحہ تھا جس نے مجھے بزدل بنا دیا تھا........(وقفہ) پھر میں نے تمہیں بہت تلاش کیا .....مگر افسوس........(خاصا جذباتی ہو جاتا ہے)

انجنا : اچھا ہی ہوا جو میں ایک کائر کی پتنی بننے سے بچ گئی۔ تمہارے لیے وہ لمحہ نامراد سہی لیکن میرے لیے وہ لمحہ بہت نیک ثابت ہوا.........مجھے اپنی زندگی میں دیوتا مل گئے......یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں کلنکی ہوں انہوں نے مجھے اپنے چرنوں میں جگہ دی........روہت کو اپنا بچہ سمجھ لیا۔

منیش: (خوش ہو کر) روہت.......کتنا پیارا نام ہے............

(اتنے میں دیال سامنے والے دروازے کا پردہ ہٹا کر کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ انجنا کچن کی طرف جانے لگتی ہے۔ دیال نشے میں جھومتا صوفے پر بیٹھ جاتا ہے)

دیال : انجو.........بیٹھو بھئی......آؤ..........

(انجنا صوفے کی کرسی پر منیش اور دیال کے سامنے، دروازے کی جانب پیٹھ کئے بیٹھ جاتی ہے، دیال جلدی جلدی دو پیگ اور بناتا ہے، دونوں پینے لگتے ہیں)

دیال : یارو! کچھ بات مت کرو.........مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ ہم برسوں سے خاموش

بیٹھے ہیں۔

منیش : پیگ ختم کر کے کھڑے ہوتے ہوئے) اچھا ڈیر دیال! اب اجازت دو۔

دیال : (منیش کا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے) اماں بیٹھ بھی.......ایسی جلدی بھی کیا ہے؟ کھانا کھا کر جانا.........

منیش (انجنا کی طرف دیکھتے ہوئے) مسز دیال کو زحمت ہوگی۔

دیال : نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں....... (انجنا سے مخاطب ہو کر) انجو.....تم کچن میں چلو......اور جو کچھ جلدی میں بنا سکو..........لے آؤ..........

(انجنا بغیر کچھ کہے کچن میں چلی جاتی ہے)

دیال : (دو پیگ اور بناتے ہوئے) لو یار! ایک ایک اور ہو جائے........

منیش : نہیں ڈیر.......میں آل ریڈی ایک پیگ زیادہ لے گیا ہوں.......تم لو.........

دیال : (لڑکھڑائی زبان میں) ٹھیک ہے........لیکن ہم تو پئیں گے یار........تم سے ایک زمانے میں ملے ہیں.......خوب سلیبر یٹ کریں گے یہ شام .... (پورا گلاس ایک ہی گھونٹ میں پی جاتا ہے۔ نشہ اس پر پوری طرح غالب ہے۔ آنکھیں مندی جا رہی ہیں۔ اعضا پر قابو نہیں رہا۔ دیال آنکھیں موند کر اپنا سر صوفے پر ٹیک دیتا ہے اسے گرد و پیش کا کوئی علم نہیں۔ اس کے برعکس منیش اپنے حواس میں ہے۔ اتنے میں سامنے والے دروازے کا پردہ ہٹا کر روہت اندر داخل ہوتا ہے۔ چاروں طرف دیکھتا ہے۔ پھر دیال اور منیش کی طرف نظر ڈالتا ہے۔ منیش اسے دیکھ کر پیار سے مسکراتا ہے)

منیش (ہاتھ بڑھا کر) آؤ بیٹا.......آؤ، ادھر میرے پاس۔

روہت : انکل! (دیال کی طرف اشارہ کر کے) ڈیڈی کو کیا ہوا؟

منیش : کچھ نہیں ہوا بیٹا، بس ذرا سو گئے ہیں........ (روہت کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب صوفے پر بٹھاتے ہوئے) آپ کا نام روہت ہے نا ؟

روہت : (فخریہ انداز سے) ہاں انکل! ماسٹر روہت دیال۔

منیش : آپ پڑھتے بھی ہیں ؟

روہت : دوسرے اسٹینڈرڈ میں.....میرے ساتھ ماسٹر ٹنکو بھی پڑھتے ہیں۔

منیش : اوہ.......ماسٹر ٹنکو! آپ کے بہت اچھے دوست ہیں ؟

روہت : ہاں.......ہم ہمیشہ کلاس میں فرسٹ اور سیکنڈ آتے ہیں۔

منیش : آپ تو واقعی بہت اچھے ہیں......بھلا بتایئے ہم کیسے لگتے ہیں آپ کو ؟

روہت : (منیش کو غور سے دیکھ کر) اچھے لگتے ہیں۔

منیش : (مسکرا کر) صرف اچھے ؟

روہت : نہیں نہیں- بہت اچھے....... (موضوع بدل کر) آپ کے گھر میں کون کون ہیں ؟

منیش : اپنے گھر میں (پھیکی ہنسی) اپنے گھر میں تو صرف ہم ہیں.........

روہت : (حیرانی سے) بس اکیلے ؟ اور کوئی بھی نہیں ؟

منیش : آپ چلیں گے ہمارے گھر ؟

روہت : آپ کے گھر میں ٹرائسکل ہے ؟

منیش : ہاں.......ہے۔

روہت : اور چابی والی موٹر اور ریل گاڑی ؟

منیش : (ہنس کر) ہاں وہ بھی ہے........

روہت : تب تو ہم ضرور چلیں گے آپ کے گھر......ممی کو بھی ساتھ لے چلیں گے۔

(اتنے میں انجنا کچن سے نکل کر کمرے میں آتی ہے- چہرے پر غصے کے اثرات جھلک رہے ہیں)

انجنا : (منیش سے مخاطب ہو کر) تم گئے نہیں ابھی تک ؟

منیش : ابھی تو جی بھر کے روہت کو دیکھا بھی نہیں (روہت سے مخاطب ہوتے ہوئے) ہم آپ کا پیار لے سکتے ہیں ؟

روہت : (شرما کر) ہمیں شرم آتی ہے.......

(منیش بڑھ کر روہت کا پیار لیتا ہے۔روہت شرما کر ہاتھ سے اپنا گال صاف کرتا ہے)

انجنا : بہت ہو چکا........اب تم یہاں سے فوراً چلے جاؤ........

منیش : لیکن جانتی ہو ابھی ابھی روہت کیا کہہ رہا تھا...... ؟ میرے گھر جانے کو کہہ رہا تھا......تمہیں ساتھ لے کر........

انجنا : (بڑھ کر روہت کو صوفے سے اٹھا لیتی ہے۔منیش نشے میں خاصا جذباتی ہو چکا ہے۔ روہت کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتا ہے۔انجنا کا چہرہ غصے سے سرخ ہو چکا ہے)

انجنا : (منیش سے) چھوڑ دو اسے......اور نکل جاؤ یہاں سے.....ورنہ.....ورنہ میں شور مچا دوں گی........

(منیش اٹھ کر روہت کو اٹھا لیتا ہے)

انجنا : (گلے کا پورا زور لگا کر چیخنے لگتی ہے) چور.......چور.........چور.........

(منیش گھبرا جاتا ہے۔روہت اس کی گود سے نکل کر انجنا سے لپٹ جاتا ہے۔انجنا اور روہت مل کر زور زور سے چلانے لگتے ہیں)

چور.........چور.........چ وووررر............

(کمرے میں روشنی دھیرے دھیرے مدھم ہوتی جاتی ہے۔منیش جلدی جلدی قدم بڑھاتا بائیں طرف کے پہلے دروازے سے باہر نکل جاتا ہے۔انجنا روہت کو بازوؤں میں بھینچ لیتی ہے۔ اور نشے میں بے ہوش دیال پر جھک جاتی ہے.......)

(پردہ)

کردار:

جگی
فرید
سائیکل سوار
اسکوٹر سوار
کانسٹبل

تھکے ہارے

دائیں بائیں تارکول کی سڑک-سامنے شیڈ والا بس اسٹاپ-آگے ایک اینٹ کی دوفٹ اونچی دیوار، جس پر پیلا ڈسٹمپر ہے۔شیڈ کے بائیں کونے پر لیمپ پوسٹ ہے، جس پر دوفٹ کی ٹیوب روشن ہے۔اسٹیج پر جتنی بھی روشنی ہے، وہ اسی ٹیوب لائٹ کی ہے۔پردہ اٹھنے پر بس اسٹاپ کی دیوار پر لیمپ پوسٹ کے نیچے، جگی اور فرید بیٹھے ہوئے ہیں۔دونوں کی عمروں میں کوئی زیادہ فرق نہیں (یہی کوئی 35-40 کے درمیان) بش شرٹ اور پتلون پہنے ہیں۔اور آخری بس کے انتظار میں کھڑے ہیں۔

جگی : (اپنے آپ سے) نہ جانے یہ بس کو کیا ہو گیا ہے ؟

فرید : (جگی سے) جناب والا! بہت ہی خراب ہے ہماری بس سروس-

جگی : بس سروس کی بھی خوب کہی آپ نے ؟ حالت تو اپنے پورے ملک کی خراب ہو چکی ہے۔کس کس بات کا رونا روئیں——جی چاہتا ہے بھاگ جائیں یہاں سے۔

فرید : لیکن جناب والا بھاگ کر جائیں بھی کہاں ؟

جگی : بس یہی تو مشکل ہے۔ہماری قوم ہی سالی بزدل ہے لڑنے سے پہلے ہی ہتھیار ڈال کے بیٹھ جاتی ہے۔

فرید : آپ کا کیا خیال ہے ؟ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔

جگی : وہی، جو ایک زندہ قوم کرتی ہے۔

فرید : مثلاً

جگی : اپنے ہونے کا ثبوت دیجئے۔ یعنی ہر لحہ اپنی موجودگی کا دوسروں کو احساس کرائیے۔ اب دیکھئے نہ —— مہنگائی کتنی بڑھ گئی ہے.........

فرید : بھلا اس سلسلے میں ہم اور آپ کیا کر سکتے ہیں؟ یہی نا کہ کل تین چپاتیاں کھاتے تھے۔ آج دو پر میں گزارہ کرلیں......

جگی : (طنزیہ لہجے میں) اور پرسوں ایک میں، اگلے روز ایک وقت میں ایک ہی سہی....... کیوں ؟

فرید : آپ دراصل میری بات کو سمجھے نہیں۔ میرے کہنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ مہنگائی کی روک تھام حکومت کا کام ہے........ ہمارا اور آپ کا نہیں........

جگی : (اسی طنزیہ انداز میں) صاحب! میں بھی یہی کہہ رہا تھا کہ ہم لوگ ازل سے بزدل ہیں اور بزدلی ہمارے خون میں اس طرح رچ بس چکی ہے کہ اب ہم اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے......

فرید : آخر اس کا کوئی حل تو ہوگا ہی ؟

جگی : کیوں نہیں ؟ اگر ہم سب مل کر مہنگے بھاؤ پر چیزیں خریدنا بند کردیں تو یہ سارا مسئلہ دنوں میں طے ہو سکتا ہے۔

فرید : (اچانک جیسے جگی کی گفتگو سے اکتا کر اپنی کلائی میں بندھی گھڑی کی طرف دیکھتا ہے، پھر بائیں طرف سر موڑ کر آنے والی بس کو) حد ہوگئی ہے جناب والا! رات کے گیارہ بج گئے ہیں اور بس کا نام ونشان نہیں.......

جگی : (جگی بھی اپنا سر بائیں طرف موڑتا ہے) میں آپ سے سچ کہتا ہوں، یہ ملک کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔

فرید : لیکن جناب والا! باہر تو بڑی عزت ہے ہم لوگوں کی!

جگی : (طنزیہ مسکراہٹ) یہی نا کہ لتا امریکنوں کے سامنے اپنے گانے سناتی ہے تو امریکی جھوم جاتے ہیں اور روی شنکر کا ستار وادن سن کر انگلینڈ والوں کو ایل ایس ڈی کا نشہ ہو جاتا ہے...... یہی بات ہے نا.......(زور دے کر) یا اور کچھ ؟

فرید : ہاں یہ بات بھی ہے لیکن جناب والا! اس کے علاوہ بھی عزت تو ہے میں آل انڈیا ریڈیو پر روزانہ حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ سنتا ہوں.........اسے سن کر تو واقعی یہی لگتا ہے کہ غیر ملکوں میں.......ہمارا ملک خاصا اہم سمجھا جاتا ہے اور پھر دیکھئے نہ آٹم بم بنانے کے بعد تو ہمارا ملک بھی اب بڑے بڑے ملکوں کے شانہ بشانہ آ کھڑا ہوا ہے.........

جگی : دیکھئے صاحب! گھر میں روٹی نہیں ہے کھانے کو اور ہم باہر چلے ہیں لوگوں کو آٹم بم دکھانے.........

فرید : یہ تو سب اپوزیشن والوں کا پروپیگنڈہ.........

جگی : لیکن صاحب! میں اپوزیشن والوں کا تنخواہ دار نہیں ہوں اس ملک کا ایک عام اور آزاد شہری ہوں۔ کسی کا دباؤ نہیں ہے مجھ پر (قدرے جوش میں) گورنمنٹ سرونٹ ہوں تو کیا ....لیکن کہوں گا وہی جو میرا جی چاہے گا........ (اچانک موضوع بدل کر) بائی دی وے....... آپ کیا کام کرتے ہیں ؟

فرید : میں؟.......میں تو بس....... یونہی......ایک چھوٹا سا آدمی ہوں.......چھوٹا موٹا کاروبار ہے............

جگی : آپ تو پھر بھی اچھے ہیں صاحب! نوکری پیشہ والوں کی تو حالت ہی خراب ہے.......

فرید : ایسی بات نہیں ہے بھائی.........کاروبار میں اب کیا رکھا ہے.........

جگی : تو پھر سکھی کون ہے اس ملک میں ؟

فرید : ہمیں تو لگتا ہے کوئی بھی سکھی نہیں..........

جگی : سکھی ہوں بھی تو کیسے ؟ دراصل اس ملک کا ہر آدمی کرپٹ ہے.........سب کو اپنی پڑی ہے.........اب دیکھئے نا آپ کے یہاں آنے سے پہلے ایک کار ادھر سے گزری تھی...... میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے رکنے کے لیے کہا مگر عین اس وقت اس نے کار کی اسپیڈ ہی بڑھا دی جیسے میں دوڑ کر کار میں گھس ہی تو جاؤں گا.......

فرید : ہاں یہ بات تو درست ہے آپ کی؟

جگی : اب اس سے پوچھئے (غصے سے) اس حرام زادے سے کہ اگر مجھے تھوڑی دور تک لفٹ دے دیتا تو کیا اس کی کار کے ٹائر میرے بیٹھنے سے زیادہ گھس جاتے ؟

فرید : آپ نے ٹھیک کہا ہے، لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے ہمدردی نہیں رہی........

جگی : کرپٹ ہیں سب (غصے سے) سب کے سب حرام زادے ہیں.......اُلو کے پٹھے ....مجھ سے تو پوچھئے صاحب یہ ملک کبھی ترقی نہیں کرسکتا۔ (اتنے میں ایک سائیکل سوار دائیں طرف سے آتا ہے۔ ہاتھ کے اشارے سے دونوں سے وقت دریافت کرتا ہے۔ جگی اسے رکنے کا اشارہ کرتا ہے۔ سائیکل سوار ایک پاؤں زمین پر اور ایک پیڈل پر رکھ کر رُک جاتا ہے)

جگی : ادھر آیئے صاحب ؟

سائیکل سوار : (گنواروں کے لہجے میں) ٹائم پوچھا ہے......ٹائم.......

جگی : آپ ادھر تو آیئے.........

(فرید چپ چاپ سب دیکھ رہا ہے۔ سائیکل سوار ڈرتے ڈرتے جگی اور فرید کی طرف بڑھتا ہے)

جگی : (سائیکل سوار سے) اتنے بڑے ہو گئے۔ کچھ تمیز بھی سیکھی ہے؟

سائیکل سوار : ٹائم پوچھا ہے؟

جگی : اس طرح پوچھا جاتا ہے ٹائم ؟

سائیکل سوار : اور کیسے پوچھوں ؟

جگی : ابے اگر ٹائم پوچھنا تھا تو اپنی اس موٹر کار سے اتر نہیں سکتے تھے؟ ہاتھ کا اشارا تو یوں کر رہا تھا جیسے کسی رنڈی کو بلا رہا ہے ؟

سائیکل سوار : ایسی بات تو نہیں ہے جی......بس ٹائم پوچھا تھا..........

فرید : (مداخلت کرتے ہوئے) جناب والا جانے دیجئے اسے.......جا بھئی جا......اب گھر جا کر دیکھنا وقت!

جگی : (فرید سے) رکئے صاحب! پہلے مجھے تمیز سکھانے دیجئے اسے........

فرید : (جگی سے) اب چھوڑیئے بھی..... (سائیکل سوار سے) اب جا بھی.......کھڑا کھڑا دیکھ کیا رہا ہے؟.......جا.......جا........

(سائیکل سوار کچھ غصے، کچھ خوف اور کچھ بے چارگی کے عالم میں جگی کی طرف دیکھ رہا ہے)

جگی : کیوں........؟ کیا ارادے ہیں ؟

فرید : (سائیکل سوار سے) ارے بھئی سنا نہیں تم نے....... جا اب راستہ لے اپنا (جگی سے) جانے دیجئے.........

(سائیکل سوار پیڈل گھماتا جگی کی طرف دیکھتا ہوا دائیں طرف نکل جاتا ہے)

جگی : دیکھا صاحب، دیکھا آپ نے.....کیا کہا تھا میں نے؟ یہ سالا ملک کبھی ترقی نہیں کر سکتا.....بھئی اگر کسی نے ہاتھ میں گھڑی باندھنے کی غلطی کر بھی لی ہے.......تو کیا اس کی سزا یہی ہے کہ ہر آنے جانے والا اشارے سے یا سیٹی بجا کر، یا منہ سے ''شی شی'' کر کے ٹائم پوچھتا پھرے ......صاحب! آپ میری مانئے تو گھڑی اتار کر جیب میں رکھ لیجئے.......ورنہ ابھی ادھر سے بہت سے لوگ گزریں گے اور سب سے اسی طرح جھگڑنا پڑے گا.........

فرید : اب بھلا کس نے گزرنا ہے یہاں سے.........

جگی : ایسا نہ کہیے صاحب! ٹائم پوچھنے والوں کا اور موت کا کوئی بھروسہ نہیں۔ نہ جانے کب آ جائے.......(قہقہہ)

فرید : (قہقہہ لگاتے ہوئے) بہت دلچسپ آدمی ہیں آپ بھی.......لگتا ہے آپ نے اسی خوف سے گھڑی باندھنا چھوڑ دیا ہے.......

(اچانک بائیں طرف سے پس پردہ کچھ لوگوں کے جھگڑنے کی آواز آتی ہے۔ فرید اور جگی کھڑے ہو کر اُدھر دیکھنے لگتے ہیں۔)

فرید : (گھبرا کر) میرا خیال ہے سامنے کوئی جھگڑا ہو رہا ہے؟

جگی : لگتا تو مجھے بھی یہی ہے......

فرید : آیئے ذرا چل کر دیکھیں.......

جگی : نہیں صاحب......یہیں کھڑے رہیے..... پہلے معلوم تو ہو کیا معاملہ ہے؟

فرید : یہ سب کچھ یہاں سے تھوڑی پتہ چلے گا......میرا خیال ہے آگے موڑ کے پاس ہی کچھ لوگ جھگڑ رہے ہیں (کسی کے چلانے کی آواز پا کر) دیکھا آپ نے؟ کوئی کسی کو پیٹ رہا ہے ....

جگی : (چونک کر) آپ نے ٹھیک کہا......جھگڑا کچھ شدید لگتا ہے کہیں خون خرابہ نہ ہو جائے۔

فرید : کیا عجب کوئی مر مرا بھی جائے.......

جگی : اس لیے کہتا ہوں آگے جانا ٹھیک نہیں.....یہیں کھڑے رہیے......ان دنوں حالات بہت نازک ہیں......کسی کے جھگڑے میں پڑنا ٹھیک نہیں.....ایسا نہ ہو کہ دوسروں کو چھڑاتے چھڑاتے ہم اپنے ہاتھ پاؤں زخمی کرا بیٹھیں........

فرید : ٹھیک کہا آپ نے.........زمانہ واقعی بہت خراب ہے........

جگی : (خاموشی پا کر) لگتا ہے جو ہونا تھا ہو گیا........

فرید : ممکن ہے اب تک کوئی مر مرا بھی گیا ہو........

جگی : اور مارنے والے کہیں بھاگ گئے ہوں.......

فرید : آیئے......ذرا تماشا تو دیکھیں.........

جگی : نہ صاحب نہ! یہیں کھڑے رہیے........وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں......ایسا نہ ہو قتل کا الزام اپنے سر آپڑے......

(اتنے میں ایک اسکوٹر سوار زخمی حالت میں بائیں ہاتھ سے اسکوٹر گھسیٹتا ہوا دائیں طرف سے آتا ہے۔ اس کی ناک سے، ماتھے سے اور دائیں ہاتھ سے خون بہہ رہا ہے......جگی اور فرید حیران نظروں سے کبھی اسے اور کبھی ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ اسکوٹر سوار ہانپتا ہوا، خوفزدہ سا دونوں کی طرف بڑھتا ہے اور ان کے قریب رک جاتا ہے)

اسکوٹر سوار : کمال ہے آپ لوگوں کے سامنے اتنا بڑا انسی ڈینٹ ہو گیا اور آپ کھڑے دیکھتے رہے ؟

جگی، فرید : (مل کر) کیوں.........کیوں؟ کیا ہوا؟

اسکوٹر سوار: دیکھ نہیں رہے آپ؟ غنڈوں نے کیا حالت بنادی ہے میری......میری گھڑی ......میرا پرس، اور میری سونے کی انگوٹھی سب کچھ چھین لیا۔اور مجھے لہولہان کردیا وہ الگ۔

فرید : (افسوس کرتے ہوئے) ہے......ہے......ہے.....کیا حالت بنادی ہے ظالموں نے آپ کی..........

جگی : بہت ہی افسوس ناک ہے یہ سب، واقعی ہمیں بہت افسوس ہے۔

فرید : کچھ آوازیں ہم نے سنی ضرور تھیں.........

جگی : لیکن ہم سمجھے......کچھ لوگ یونہی بات چیت کررہے ہوں گے اگر ہم کہیں ان غنڈوں کو آپ کو مارتے دیکھ لیتے تو کیا آپ کی مدد کو نہ آتے...........

فرید : ضرور آتے جناب والا! ایسی بات نہیں ہوسکتی.......

جگی : آخر اخلاق بھی تو کوئی چیز ہے........

فرید : اب آپ فوراً ہسپتال جائیے........

جگی : بہت گہرے زخم آئے ہیں.........

اسکوٹر سوار : یہاں سے پولس اسٹیشن قریب ہے.......آپ لوگوں کو تکلیف تو ہوگی....... اگر آپ میرے ساتھ چلیں تو آپ کی گواہی ہوسکتی ہے.........

فرید : گواہی؟......ہاں.......ہاں........

جگی : (ٹوکتے ہوئے) گواہی دینے میں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے.....لیکن ایک تو ہم لوگوں نے ان غنڈوں سے آپ کو پٹتے نہیں دیکھا.......

فرید : دوسرے......رات بہت ہوچکی ہے.....ہمیں گھر بھی پہنچا ہے......

اسکوٹر سوار : میں آپ لوگوں کی پریشانی کو سمجھتا ہوں......لیکن اگر آپ میرے ساتھ چلتے تو زیادہ اچھا ہوتا.......خیر! آپ لوگ اپنا نام اور پتہ تو دے دیجئے میں پولس اسٹیشن میں بتادوں گا کہ آپ لوگوں کے سامنے یہ سب ہوا.......

فرید : ہاں.......ہاں......ضرور.........

اسکوٹر سوار : اگر پولس والے کل پرسوں میں آپ کے ہاں آئیں تو آپ نے جو کچھ سنا

یادیکھا ہے......ضرور کہہ دیجئے گا......پلیز!

جگی : کیوں نہیں؟ کیوں نہیں؟ اس میں 'پلیز' کی کیا بات ہے؟

فرید : یہ تو ہمارا فرض ہے بھائی......

جگی : میرا نام جگی ہے......میں آٹھ بلاک، سترہ نمبر کوارٹر، پشوری مارکیٹ میں رہتا ہوں ......(جب سے کاغذ اور پین نکال کر لکھتے ہوئے) ٹھہریئے میں آپ کو لکھے دیتا ہوں......(پھر فرید سے مخاطب ہو کر) ہاں صاحب! آپ بھی لکھوا دیجئے نام اور پتہ......

فرید : لکھئے......(وقفہ) فرید......احمد......نہیں نہیں......فرید خان لکھئے۔ جے ہند ہوزری ورکس......نیا بازار! (جگی کاغذ پر نام، پتے لکھ کر اسکوٹر والے کی جیب میں ڈال دیتا ہے۔ اسکوٹر والا "تھینکس" ویری مچ کہہ کر دھیرے دھیرے آگے بڑھتا ہے)

جگی : دیکھا صاحب آپ نے ؟

فرید : آپ واقعی بہت سمجھدار ہیں......

جگی : اگر ہم وہاں پہنچ جاتے تو پٹتے سو پٹتے، تھانے الگ جاتے گواہی دینے......

فرید : (رازدارانہ لہجے میں) ایک بات پوچھوں آپ سے؟ آپ نے اسکوٹر والے کو اپنا نام پتہ صحیح لکھ کر تو نہیں دے دیا؟

جگی : (ہنس کر) صاحب! اتنا بیوقوف نہیں ہوں میں......نام تو صحیح ہے لیکن نہ اس شہر میں ایسی کوئی مارکیٹ، نہ بلاک نہ کوارٹر......

فرید : (چین کا سانس لے کر) ہم بھی بس بال بال بچے جناب والا! اصلی پتہ لکھوانے ہی والے تھے کہ نہ جانے کہاں سے خدا نے ہمارے کانوں میں کچھ پھونک دیا۔ (ہنستے ہوئے) نام تو تقریباً ہم نے بھی صحیح لکھوایا ہے لیکن پتہ ایسا کہ پورا شہر تو کیا پورا ملک بھی چھان جاؤ تو خاک پاؤ......(دونوں زور زور سے ہنستے ہیں)

جگی : فرید صاحب! بہت اچھا کیا آپ نے......ورنہ آپ نہیں جانتے یہ پولس والے بال کی کھال اتارتے ہیں......آپ وہاں کیا کرنے گئے تھے......کیسے گئے تھے......کیوں گئے تھے؟

فرید : لینے کے دینے پڑ جاتے صاحب !

جگی : سچ کہتے ہیں آپ! یہ پولس والے تو........

(جگی دائیں طرف سے ایک کانسٹبل کو آتا دیکھ کر اچانک چپ ہو جاتا ہے۔ پھر فرید کے کان کے پاس منہ لے جا کر) لیجئے.....نام لیا اور آپہونچے.....ایسے ہوتے ہیں یہ........اگر یہ کچھ پوچھے تو کہیے گا ہمیں کچھ معلوم نہیں........

کانسٹبل : (زوردار آواز میں) کون ہو تم لوگ؟ یہ آدھی رات کو کیا ہو رہا ہے؟

جگی : سنتری جی ناراض کیوں ہوتے ہو؟ ہم لوگ تو گھر گرہستی والے آدمی ہیں۔

فرید : بس کے انتظار میں کھڑے ہیں بھئی........

جگی : کوئی چور، اُچکے تھوڑے ہی ہیں۔

کانسٹبل : (اسی لہجے میں) میں پوچھتا ہوں یہاں آدھی رات کو آپس میں کیا سازش پکا رہے ہو ؟

جگی : کہا تو ہے سنتری جی.....گھر جانے کے لیے بس کا انتظار کر رہے ہیں۔

کانسٹبل : (غصے میں) اب آدھی راتوں میں تمھاری ماں بس چلاتی ہے؟ بتاؤ......کیا گڑبڑ کر رہے ہو ؟

جگی : (جھنجھلا کر) کمال ہے صاحب! آپ تو گالی پر اُتر آئے؟

فرید : ہم لوگ تو شریف آدمی ہیں سپاہی جی!

کانسٹبل : یہ وقت شریف آدمیوں کے گھر سے نکلنے کا ہے؟ بتاؤ؟ چلو تھانے میں چلو...... تمھاری شرافت کی تقریر وہیں سنوں گا......چلو آؤ میرے ساتھ.......

فرید : (جگی سے مخاطب ہو کر) جگی صاحب! آپ ذرا یہیں رکئے.....میں سپاہی جی سے کچھ بات کرلوں (فرید کانسٹبل کو سڑک کے بائیں کونے پر لے آتا ہے۔ دونوں کا رخ سامعین کی طرف ہے) سپاہی جی! یقین کیجئے۔ میں واقعی شریف اور بال بچے دار آدمی ہوں........

کانسٹبل (جگی کی طرف اشارہ کر کے) یہ کون ہے تمھارا؟

فرید : (لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے) میں کیا جانوں حضور! مجھ سے پہلے ہی بس اسٹاپ پر کھڑا

ہوا تھا......قسم خداوند پاک کی.....میرا اس شخص سے کوئی تعلق نہیں (اتنے میں جیب سے کچھ نکال کر کانسٹبل کی مٹھی میں تھماتے ہوئے) یہ تو......حضور.....بس......چائے پانی......کے لیے ہیں ....

کانسٹبل :(مٹھی کھولے بغیر) اچھا......اچھا......اب جا......بھاگ جا یہاں سے اگر کہیں انسپکٹر صاحب آ گئے تو آوارہ گردی کے جرم میں گرفتار کر لیا جائے گا.......جا......بھاگ جا.........

(فرید دائیں طرف جلدی جلدی قدم بڑھاتا ہوا اوجھل ہو جاتا ہے......کانسٹبل مٹھی کی رقم جیب میں ڈالتا ہے اور سامنے جگی کی طرف بڑھتا ہے)

کانسٹبل : کیوں بے شہدے! کیا ارادے ہیں تیرے ؟........

جگی : (خوفزدہ سا) سنتری صاحب! میں کوئی چور اچکا نہیں ہوں......میرا نام جگی ہے ......گورنمنٹ سروس میں ہوں.........

کانسٹبل : (جیسے کچھ نہ سنتے ہوئے) ہاں......ہاں.....ٹھیک ہے......ٹھیک ہے...... نکال.....کیا ہے تیرے پاس........

جگی : (کانسٹبل کا مدعا سمجھ کر).....میرے پاس تو سنتری صاحب! ایک ہی روپیہ ہے اور کچھ ریز گاری (جیب میں ہاتھ ڈال کر نکالتا ہے) آخری تاریخیں ہیں مہینے کی......کوئی غلطی ہو گئی ہے تو معاف کر دیجیے سنتری صاحب......میں پیدل ہی گھر چلا جاتا ہوں........

کانسٹبل : (بڑی نفرت سے جگی کی طرف دیکھ کر روپیہ اور ریز گاری لے لیتا ہے) چل اب ......پھوٹ جا یہاں سے.....چل پھوٹ.....(جگی تیز رفتار سے دائیں طرف چلتا ہوا اسٹیج سے اوجھل ہو جاتا ہے۔کانسٹبل آگے بڑھ کر بس اسٹاپ کی دیوار پر بیٹھ جاتا ہے۔بیڑی سلگا کر ایک لمبا کش لیتا ہے۔پھر جیب سے روپے اور ریز گاری نکال کر گنتا ہے)

کانسٹبل :(بُرا سا منہ بنا کر انتہائی نفرت سے) کیسے حرام خور ہیں آج کل کے لوگ۔گھر سے چلتے ہیں تو جیبیں جھاڑ کر.......(زمین پر تھوکتے ہوئے) اُلّو کے پٹھے.........

(پردہ)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

اردو سفرناموں میں ہندوستانی تہذیب وثقافت

مرتب : خواجہ محمد اکرام الدین

صفحات:494

قیمت :-/166 روپے

کلیاتِ سجاد ظہیر

مرتبین: نجمہ ظہیر باقر، علی باقر

صفحات:388

قیمت :-/146 روپے

کلیاتِ ماجدی

ترتیب وتدوین: عطاء الرحمٰن قاسمی

صفحات:666

قیمت :-/196 روپے

حسن نعیم اور نئی غزل (تجزیہ وتنقید)

مصنف: احمد کفیل

صفحات:284

قیمت :-/104 روپے

پیروڈی: نقد وانتخاب (جلد اول)

مرتبہ : امتیاز وحید

صفحات:354

قیمت :-/118 روپے

پیروڈی: نقد وانتخاب (جلد دوم)

مرتبہ : امتیاز وحید

صفحات:368

قیمت :-/133 روپے

₹ 157/-

ISBN: 978-93-5160-032-9

9 789351 60-032-9

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025